قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

فروری 1966

اقبالؒ کا پیغام ۔۔ صدر ایوب کے نام

۱۹۲۲ء میں جب یورپ کی تمام قوتیں ترکی کو ختم کر دینے کا تہیہ کئے بیٹھی تھیں ، علامہ اقبالؒ نے مصطفیٰ کمال (مرحوم) کو ایک پیغام دیا تھا ۔ اِس وقت پاکستان کو بھی ویسی ہی مشکلات کا سامنا ہے ۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر علامہ اقبالؒ اس وقت ہم میں موجود ہوتے تو وہ یہی پیغام صدر محترم محمد ایوب خاں کو بھی دیتے ۔ وہ پیغام یہ ہے :۔

آشنے بود کہ ما از اثر حکمتِ او ۔۔۔ واقف از سرِّ نہاں خانۂ تقدیر شدیم
اصلِ ما یک شرر باختہ رنگے بودست ۔۔۔ نظرے کرد کہ خورشید جہانگیر شدیم
نکتۂ عشق فروشست ز دل پیرِ حرم ۔۔۔ در جہاں خوار باندازۂ تقصیر شدیم
بادِ صحراست کہ با فطرتِ ما در سازد ۔۔۔ از نفسہائے صبا غنچۂ دلگیر شدیم
آہ آں غلغلہ کز گنبدِ افلاک گذشت ۔۔۔ نالہ گردید چو پابند بم و زیر شدیم
اے بسا صید کہ بے دام بفتراک زدیم ۔۔۔ در بغل تیر و کماں کشتۂ نخچیر شدیم

" ہر کجا راہ دہد اسپ براں تاز کہ ما
بارہا مات دریں عرصہ بتدبیر شدیم "
(نظیری)

شائع کردہ

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵۔ بی گلبرگ لاہور

قیمت فی پرچہ : ایک روپیہ

اس کتاب کا برسوں سے انتظار تھا

اسلام کیا ہے

پرویز

ہمارا یہ دعوے ہے (اور مبنی برایمان دعوے) کہ اسلام، نوع انسان کی تمام مشکلات کا حل پیش کرتا ہے۔ لیکن جب یہ پوچھا جاتا ہے کہ اسلام ہے کیا تو مختلف گوشوں سے مختلف آوازیں اٹھتی ہیں جن کا ماحصل نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ کے مسائل سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اگر اسلام صرف یہی ہے تو اس سے زندگی کے مسائل کا حل نہیں مل سکتا۔

اسلام ایک نظام حیات ہے جس کی بنیادیں چند غیر متبدل تصورات پر قائم ہیں۔ جب تک یہ تصورات واضح طور پر سامنے نہ آئیں، اسلام بہ حیثیت ایک نظام حیات کے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ضرورت تھی کہ ان تصورات کو واضح اور دل کش انداز میں ایک جا پیش کیا جائے ـــــ یہ کتاب اس ضرورت کو پورا کر دیتی ہے۔

کتاب سولہ (۱۶) ابواب پر مشتمل ہے جن میں سے ہر باب مصنف کے مدت العمر کے مطالعہ اور تدبر فی القرآن کا ماحصل پیش کرتا ہے۔ یہ کتاب:

(۱) ہمارے مذہب گزیدہ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے مطالعہ میں آجائے تو انہیں علیٰ وجہ البصیرت اسلام کا گرویدہ بنالے۔ اور

(۲) غیر مسلموں کے ہاتھ میں دیدی جائے تو اسلام کے متعلق ان کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں۔

کتاب قریب پونے چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ اور دو اقسام میں شائع کی گئی ہے۔

قسم اوّل۔ اعلیٰ سفید کاغذ۔ مضبوط جلد۔ حسین گرد پوش۔ قیمت فی جلد۔ آٹھ روپے۔

قسم دوم۔ مکینیکل پیپر۔ بکس بورڈ کور۔ قیمت فی جلد۔ چار روپے۔

فرمائش کے ساتھ اس کی تصریح کر دی جائے کہ کونسی قسم کی جلد مطلوب ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵ ربی۔ گلبرگ۔ لاہور

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوع اسلام

لاہور

بدل اشتراک
سالانہ پاک و ہند سے دس روپے
سالانہ غیر ممالک سے ایک پونڈ

قیمت فی پرچہ
پاک و ہند سے ایک روپیہ

ٹیلیفون (۸۰۸۰۰)
خط و کتابت کا پتہ
ناظم ادارہ طلوع اسلام
۲۵/بی گلبرگ - لاہور

جلد ۱۹ ★ فروری ۱۹۶۶ء ★ نمبر ۲

فہرست مضامین

لمعات ——— ۲
حقائق و عبر ——— (رزق کی ذمہ داری) ——— (آزمائش) ——— ۱۵
ایک چراغ اور لاکھ اندھیرے ——— (محترم پرویز صاحب) ——— ۲۵
عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں ——— (محترم عنایت اللہ صاحب) ——— ۴۱
سائنس اور ایمان ——— (محترم پرویز صاحب) ——— ۴۹
چیانگ ازم ——— ۵۷
ان سے اسلامی قوانین بنوایئے ——— ۶۲
دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا! ——— (محترم خورشید عالم) ——— ۶۵
نقد و نظر ——— (حقیقت المسیح) ——— (کچکول نامہ) ——— (سفر) ——— ۷۲
بچوں کا صفحہ ——— (دوسروں کے لئے جیو) ——— (رونس بھیا) ——— ۷۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

سالِ نو (۱۹۶۶ء) کے پہلے مہینے کا نصفِ اول پاکستان کے لئے ایک عجیب قسم کی گردشِ دولابی کا مظہر ثابت ہوا ـــ اطمینان بخش بھی اور حسرت انگیز بھی ـــ ۴ جنوری کو تاشقند کی وہ کانفرنس شروع ہوئی، جو تاریخی اہمیت کی حامل ہے؛ یا کم از کم جسے اس اہمیت کا حامل بنا دیا گیا ہے۔ کانفرنس کے انعقاد کے دوران جب یہ تصور ہمارے سامنے آتا تھا کہ صدر ایوب، مسٹر شاستری کے روبرو بیٹھے، گفتگوئے مصالحت کر رہے ہیں تو ہماری روح میں کپکپی کی ایک لہر اٹھتی تھی۔ وہ شاستری کہ جس کی انگلیوں سے ہنوز ہزارہا بے گناہ مظلوم انسانوں کا خون ٹپک رہا تھا۔ وہ جس کا اٹھارہ ماہ کا دورِ اقتدار دنیا میں ابلیسی سیاست کا بدترین نمونہ قرار دیا جائے گا۔ وہ جسے نہ عہد کا پاس تھا، نہ کسی قول اقرار کا لحاظ، جو بات بات پر مکرتا اور قدم قدم پر پھر جاتا تھا۔ جس کی مصنوعی ہنسی میں ہزارہا ہر منی فریب چھپے رہتے تھے۔ اور جس کی کوتاہ آستینی، دراز دستیوں کی تاریک ترین مثال تھی۔ اس شاستری سے صدر ایوب کو آمنے سامنے بیٹھ کر مصالحت کی گفتگو کرنی پڑی۔

مملکت کی سربراہی کی ذمہ داریوں کے تقاضے بھی کس قدر شدید ہوتے ہیں (بلا تمثیل) خود حضور نبی اکرمؐ کو صلح حدیبیہ کے وقت، عروہ اور سہیل جیسے متشدد اعدائے اسلام سے گفتگو کرنی پڑی تھی ـــ اگرچہ (مثال میں ہی سہی) شاستری کو عروہ کا ہم نشین قرار دینا، عروہ کے ساتھ زیادتی ہے ـــ ان لوگوں کی دشمنی میں بھی ایک وقار ہوتا تھا ـــ تاریخ ہمیں بتاتی ہے۔ کہ دورانِ گفتگو عروہ نے حضور رسالتمآبؐ کی شانِ اقدس میں ذرا سی سوء ادبی کی، تو حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے اسے سختی سے ٹوکا اس نے حضورؐ

سے دریافت کیا۔ کہ یہ کون ہیں ؟ آپنے فرمایا۔ "ابوبکر" ۔ عروہ نے کہا کہ میں ان کی سخت کلامی کا جواب دیتا۔ لیکن کیا کروں۔ ان کا ایک احسان میری گردن پر ہے جس کا میں ابھی تک بدلہ نہیں اتار سکا۔ اس لئے مجبور ہوں ۔۔۔ مشرکین عرب تو اس کیرکٹر کے مالک تھے۔ شاستری کو ان کا ہم رکاب قرار دینا واقعی اُن کی توہین ہے ۔۔۔ بہرحال یہ تھی صدر ایوب کی مجبوری (حشر مرحوم سے معذرت) کے ساتھ

کسے معلوم تھا "عشق" اس طرح لاچار کرتا ہے
دل اس کو چاہتا ہے بیوفا اور پیار کرتا ہے

کانفرنس کی کارروائی جاری تھی۔ اور قوم اس کے نتیجہ کے انتظار میں ہمہ تن گوش۔ ہمارا خیال ہے۔ کہ اہل پاکستان نے اس سے پہلے شاید ہی کسی سیاسی مسئلہ کے متعلق اس قدر جذب و انہماک سے دلچسپی لی ہو۔ قوم کا ایک ایک فرد، ہمہ تن اضطراب بھی تھا اور مجسم انتظار بھی۔ ۱۰ر جنوری (سوموار) کی صبح تک یہ خبریں آرہی تھیں۔ کہ کانفرنس ناکام رہی اور شرکاء واپسی کے لئے رختِ سفر باندھ رہے ہیں۔ آپ قوم کے جذبات کا اس سے اندازہ لگائیے۔ کہ اس (ناکامی) کی خبر سے، اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہفتہ بھر کا اعصابی تشنج سکون میں بدل گیا۔ کہ یکایک شام کو ریڈیو سے، اس مشترکہ اعلامیہ کا اعلان ہو گیا۔ جس پر فریقین نے دستخط کئے تھے۔

اعلامیہ کو سن کر ہمارا تاثر یہ تھا۔ کہ اس سے ہم نے کچھ پایا ہے۔ کھویا نہیں۔ اس کی بعض شقیں مسٹر شاستری کی شکست کی آئینہ دار تھیں۔ اور دوسری شقوں کے مطابق، ہم اسی مقام پر کھڑے تھے جس مقام پر ہم تاشقند جانے سے پہلے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہمارا ردعمل یہ بھی تھا۔ کہ اعلامیہ کی زبان بڑی ڈپلومیٹک ہے۔ جس کی وجہ سے عوام اس کے مضمرات کو سمجھ نہیں سکیں گے۔ ضرورت ہے کہ اس کے مضمرات کی صحیح تعبیر عام فہم الفاظ میں سامنے لائی جائے۔ لیکن وہاں سے اس قسم کی کوئی وضاحت نہ آئی۔ وزارتِ امورِ خارجہ کے سیکرٹری نے ایک پریس کانفرنس میں کچھ وضاحتی جملے کہے۔ لیکن مقصد پیش نظر کے لئے وہ نہ ہونے کے برابر تھے۔ اس سکوت سے یہاں عوام پر مایوسی چھا گئی۔ عام اثر یہ لیا گیا۔ کہ

مقامِ ہوش سے آساں گذر گیا اقبالؔ
مقامِ شوق میں کھویا گیا یہ دیوانہ!

یہ اثر لمحہ بہ لمحہ شدید ہوتا گیا۔ ایک تو اس لئے کہ یہ اعلان اچانک سامنے آگیا۔ اس سے پہلے آمدہ خبروں سے یہی منترشح ہوتا تھا۔ کہ کانفرنس بغیر کسی اعلامیہ کے ختم ہو جائے گی۔ اور (جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے) قوم نے اسے خوش آمدید کہا تھا۔ اب جو یکایک یہ اعلامیہ سامنے آیا۔ اور وہ بھی اس قسم کی مبہم ڈپلومیٹک

زبان میں، جس کے افراد کے میں بھی انکار کے سو پہلو جھلملایا کرتے ہیں۔ قوم پر افسردگی چھا گئی۔ ہندو کی ڈپلومیسی نے اس افسردگی میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ اس نے ایک سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق اس اعلامیہ کا استقبال انتہائی جوش و مسرت سے کیا۔ ان کے ریڈیو نے جب اس کا اعلان کیا تو اس قسم کی فضا پیدا کرتے ہوئے گویا ان کے پردھان منتری کی اس کامیابی پر دہاں گھی کے چراغ جلائے جا رہے ہیں اور ملک اپنے "فاتح و منصور ہیرو" کے استقبال کی تیاریاں بڑے جوش و خروش سے کر رہا ہے۔ اس سے یہاں کے عوام کے اس گمان کو اور بھی تقویت مل گئی کہ یہ اعلان ہندوستان کی کامیابی اور ہماری شکست کا منشور ہے۔

المیۂ شب تاشقند میں مسٹر شاستری کا اچانک انتقال ہو گیا۔ لیکن ہندوؤں نے اس سے بھی فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے اسے "فاتح تاشقند" کی حیثیت سے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اور اس کی سیاست دانی، تدبر، عزم، استقلال کے ڈھول اس بلند آہنگی سے پیٹے کہ (کم از کم کچھ وقت کے لئے) دنیا کو یقین آ گیا کہ اس نے واقعی بہت بڑا میدان مارا ہے۔ اس پر روس، امریکہ، برطانیہ وغیرہ کی تبریک و تہنیت ـــــ ہر جگہ خوشی کے شادیانے، ـــ مسرتوں کے نغمے ـــ ایک طرف یہ گرم جوشی ـــ دوسری طرف کامل سکوت، نتیجہ یہ کہ پاکستانی عوام کی مایوسی انتہا تک پہنچ گئی۔

ایک تو مایوسی کا ردِ عمل ویسے ہی کشتی ہوتا ہے۔ اس پر ہوا دینے والوں کی وسوسہ انگیزیاں، جو ایسے مواقع کی گھات میں رہتے ہیں ـــ قوم میں انتشار کے آثار پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ اور (جیسا کہ ایسے حالات میں ہوتا ہے) طالب علموں کا طبقہ خاص طور پر اس سے متاثر ہوا۔ جوانی تو ہوتی ہی دیوانی ہے۔ اور پھر ایسے حالات میں! ـــ ہمیں یہ دیکھ کر از حد رنج ہو رہا تھا کہ ہمارے ارباب دانش کے ذرا سے تسامح سے کس طرح جیتی ہوئی بازی ہار دی گئی ہے

بایں ہمہ، قوم کی خوش قسمتی تھی کہ صدرِ قوم نے موقعہ کی نزاکت کو بھانپا، اور ۴ر جنوری کی دوپہر ٹھیک اسی وقت، جس وقت انہوں نے ۲ر ستمبر کو قوم سے خطاب کیا تھا، "میرے عزیز ہموطنو!" کہہ کر قوم کو آواز دی۔ اور اعلانِ تاشقند کے مضمرات کی صحیح تعبیر پیش کی۔ اس تعبیر سے یہ حقیقت سامنے آ گئی کہ ہم نے اس کانفرنس سے کچھ پایا ہی ہے۔ کھویا کچھ نہیں ـــ قوم مطمئن ہوئی، لیکن ہر ایک کی زبان پر یہی تھا کہ اے کاش! یہ وضاحت تین دن پہلے ہو جاتی۔ اگلے دن، مسٹر بھٹو نے اپنے مخصوص انداز میں اس کی مزید وضاحت کی اور غیر مبہم الفاظ میں کہا کہ جہاں تک کشمیر کے مسئلہ کا تعلق ہے، ہم اپنے موقف سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹے۔ ہماری منزل وہی ہے، مقصود وہی نصب العین وہی ہے اور

مطالبہ وہی۔ اگر یہ مقصد صلح کی گفتگو سے حاصل ہوتا ہے تو ہو المراد۔ اور اگر یہ کوشش ناکام ثابت ہوتی ہے تو پھر ہمارے سامنے دوسرے راستے موجود ہیں۔

خدا کرے کہ جو سکون ان وضاحتی بیانات سے پیدا ہوا ہے۔ وہ پائیدار ثابت ہو[1]۔ ملک اس وقت اپنی تاریخ کے بڑے ہی نازک دور سے گذر رہا ہے۔ اس سے صحیح وسلامت گزرنے کے لئے ملک کا اندرونی امن اور یک جہتی شرط اولیں ہے۔ اس کے لئے اربابِ حکومت کو بڑی دور اندیشی اور معاملہ فہمی سے کام لینا چاہیئے۔ اور قوم کو انتہائی ضبط اور تحمل سے۔ حالیہ حادثات کے سلسلہ میں کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اربابِ اقتدار کو قوم کے تاثرات اور جذبات کا صحیح اندازہ نہیں ہوا۔ اس لئے کہ یہ باور کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ کہ ان حضرات کو قوم کے اس قدر شدید تاثرات اور گہرے جذبات کا صحیح اندازہ ہو اور وہ لوگوں کی اطمینان دہی کے لئے ہر وقت اقدام نہ کریں۔ بالخصوص جب یہ اطمینان ایک وضاحتی بیان سے ہو سکتا ہو۔ جہاں تک طالب علموں کا تعلق ہے۔ ہمیں اس تلخ حقیقت کو (جسے ہم گذشتہ اٹھارہ برس سے مسلسل پیش کرتے چلے آ رہے ہیں۔) ایک بار پھر بڑے ہی افسوس کے ساتھ دہرانا پڑتا ہے کہ ہم نے ان کی صحیح تعلیم و تربیت کی طرف سے مجرمانہ تغافل برتا ہے۔ ہمارا نصابِ تعلیم بڑا ناقص ہے اور نظامِ تعلیم اس سے بدتر۔ نصابِ تعلیم میں اس کا شائبہ تک نہیں۔ کہ وہ مستقل اقدار کیا ہیں۔ جن سے آدمی، انسان۔ اور انسان مومن بنتا ہے۔ اور اور نظامِ تعلیم میں اس کا تصور تک نہیں کہ نوجوان طالب علموں کی ذہنی اور قلبی تربیت کس طرح کی جاتی ہے۔ اور اساتذہ کے خیالات اور کردار کا طلباء کی نفسیات پر کتنا گہرا اثر پڑتا ہے۔ بس ایک ڈگر ہے جس پر سب آنکھیں بند کر کے چلے جا رہے ہیں۔ اس میں کچھ فرق آیا ہے تو صرف اس قدر کہ عوام کو خوش کرنے کے لئے دینیات کے نام سے کچھ کتابیں پڑھا دی جاتی ہیں۔ باقی رہا شعبۂ اسلامیات۔ سو وہ حکومت کے خرچ پر جماعت اسلامی کے ایسے کارکن تیار کرنے کی کارگہ ہے جو مختلف کالجوں میں پہنچکر طلبا کو اپنا ہم خیال بنائیں۔ موجودہ نظامِ تعلیم طلباء کے لئے ذہنی اطمینان اور قلبی سکون پیدا کرنے سے یکسر قاصر ہے جس کا نتیجہ مایوسی (FRUSTRATION) ہے۔ یہی مایوسی وقتاً فوقتاً ان کی سرکشی کی صورت میں ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ انتظامیہ اسے بزور دبا کر مطمئن ہو جاتی ہے کہ مسئلہ حل ہو گیا اور نہیں سمجھتی کہ ؎

ہوتے ہیں اگر بند تو چڑھ جاتے ہیں نالے

ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ کہ ہم اربابِ اقتدار کو کس طرح سمجھائیں۔ کہ تعلیم کا مسئلہ ہندوستان

---

[1] واضح رہے کہ یہ سطور ۱۷ جنوری کو سپردِ قلم کی جا رہی ہیں اور قارئین کے ہاتھوں میں پرچہ یکم فروری کو پہنچے گا۔

کے ساتھ جنگ کے مسئلہ سے بھی زیادہ اہم ہے۔ اور اس کا علاج پیوند سازی سے نہیں ہو سکتا۔ اس کا حل نصاب اور نظام کے پورے انقلاب سے ہوگا۔ اگر ہم ایسا انقلاب نہیں لاتے تو ہمیں اس کا قطعاً حق نہیں پہنچتا۔ کہ ہم قوم کی بے راہ روی کا رونا روئیں۔ قوم انہی طالب علموں ہی کا تو نام ہے۔ جن کی طرف سے اس طرح بے اعتنائی برتی جا رہی ہے۔

※

اس سے آگے بڑھیئے۔ تو ایک اور بات ہمارے سامنے آتی ہے۔ جب کبھی ملک میں انتشار پیدا ہوتا ہے تو ارباب حل و عقد پکار اٹھتے ہیں کہ ملک میں ایسا تخریبی عنصر موجود ہے۔ جو اس قسم کا انتشار پیدا کراتا رہتا ہے۔ یہ بات نئی نہیں۔ اس کا سلسلہ تشکیل پاکستان کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا مثلاً قائد اعظمؒ نے مارچ ۱۹۴۸ء میں ڈھاکہ کی ایک تقریر کے دوران فرمایا تھا۔ کہ

> میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں۔ کہ ہمارے اندر وہ لوگ موجود ہیں جو بیرونی قوتوں سے مالی امداد حاصل کر کے پاکستان کے درپئے تخریب ہیں۔ میں آپ لوگوں کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ کہ آپ ان سے ہوشیار رہیں اور ان کے دلکش نعروں اور جاذب وعدوں کے فریب میں نہ آئیں۔
>
> (ڈان ۔ ۲۳ مارچ ۴۸ء)

اسی طرح وزیر اعظم لیاقت علی خان (مرحوم) نے ایک بیان میں کہا :۔

> بعض سازشی گروہ ملازمین حکومت کی مشکلات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر انہیں اپنے مقاصد براری میں استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ اپنے مشئوم عزائم میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ ملازمین کے دل میں کھوٹ نہیں۔ وہ گروہ انتہائی کوشش کر رہے ہیں کہ ملازمین میں انتشار اور کشمکش پیدا کر کے نظامِ حکومت کو مفلوج کر دیں۔ مجھے یقین ہے۔ کہ ملازمین حکومت کی غالب اکثریت ان لوگوں کی فتنہ سامانیوں سے آگاہ ہے۔
>
> (ڈان ۔ ۱۳ مارچ ۴۸ء)

اس قسم کی تنبیہات دیگر ذمہ دار اربابِ حکومت کی طرف سے بھی دی گئیں۔ اس پر ہم نے جون ۱۹۴۸ء کے لمعات میں لکھا تھا کہ

> گزشتہ دو تین ماہ سے آپ برابر سنتے چلے آ رہے ہیں کہ حکومت کے دفاتر میں "ففتھ کالم" سرایت کر چکا ہے۔ جو اپنی خفیہ تدابیر سے قصرِ حکومت کی تخریب میں مصروف ہے۔ محترم قائد اعظم جناب وزیر اعظم اور وزیر مالیات محترم غلام محمد صاحب اور دیگر اربابِ بست و کشاد نے متعدد بار اس حقیقت کو دہرایا ہے کہ یہ تخریبی

قوتیں اندر ہی اندر ہمارے دفاتری نظام کو متاثر کر رہی ہیں بالعموم یہ وہ لوگ ہیں جو حصول پاکستان سے پہلے نیشنلسٹ مسلمان کہلاتے تھے اور جنہوں نے اپنی تمام عمر تحریک پاکستان کی مخالفت میں گزار دی تھی ہم نے اس سے پیشتر بھی لکھا تھا۔ اور اسے پھر دہراتے ہیں کہ جو کچھ ہمارے ارباب حل وعقد نے بار بار کہا ہے اگر وہ حقیقت ہے (اور اسکے حقیقت ہونے میں کسے شبہ ہو سکتا ہے) تو پھر حکومت نے اس خطرناک فتنہ کے استیصال کیلئے آج تک کیا عملی قدم اٹھایا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہم فقیر گوشہ نشین رموز مملکت سے واقف نہیں ہو سکتے۔ لیکن یہ تو ہر ایک آنکھ دیکھ رہی ہے کہ اس وقت تک مرکزی حکومت کے دفاتر سے کسی ایک شخص کو بھی اس جرم کی پاداش میں الگ نہیں کیا گیا۔ کہ وہ "فتنہ کا علم" سے متعلق ہے اور تخریبی سازشوں کا معاون۔ ان حالات کے پیش نظر ایک عام انسان بہر حال اس نتیجہ پر پہنچے گا۔ کہ

(۱) یا تو جو کچھ ان حضرات نے آج تک اس باب میں کہا ہے وہ غلط تھا۔

(۲) اور اگر وہ صحیح تھا تو اس فتنہ کے استیصال کے لیے کوئی عملی قدم نہ اٹھانا تخریب پاکستان کے جرم عظیم کی کھلی ہوئی معاونت ہے جسکے مرتکب خود ارباب حکومت ہو رہے ہیں۔

کیا ہم دریافت کر سکتے ہیں کہ ان دونوں شقوں میں سے کونسی شق درست ہے۔"

اُس وقت سے اس وقت تک مسلسل یہ ہو رہا ہے کہ ملک میں جب بھی کسی انتشار کی صورت رونما ہوتی ہے۔ خطرے کی گھنٹی بجا دی جاتی ہے۔ کہ ملک میں پاکستان دشمن تخریبی گروہ موجود ہے جس سے عوام کو متنبہ رہنا چاہیئے۔ چنانچہ صدر محترم نے اپنے حالیہ بیان میں بھی فرمایا ہے۔ کہ

کچھ لوگ شاید آپ کو گمراہ کرنے کی کوشش کریں۔ آپ ایسے شر پسندوں سے ہوشیار رہیں۔ وہ تو موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ (مشرق - ۱۵/۱/۶۶)

لیکن اس خطرہ کی گھنٹی کے بعد اس شر پسند تخریبی عنصر کے استیصال کے لئے کچھ نہیں کیا جاتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ آہستہ آہستہ لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ ملک میں کوئی ایسا گروہ فی الواقع موجود نہیں۔ حکومت یونہی خطرہ کی گھنٹی بجا دیتی ہے۔ اور اس طرح اپنی کوتاہیوں کو (موہومہ) شر پسند گروہ کی سازشی کارروائیوں کے سر تھوپ کر اپنی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے خیالات کو تقویت بعض واقعات سے بھی مل جاتی ہے۔ مثلاً یہ واقعہ عوام کے ذہن میں ابھی تک تازہ ہے کہ مرکزی حکومت کے وزیر امور داخلی نے (قریب دو سال ادھر) حتمی اور یقینی طور پر اعلان کیا۔ کہ ملک کی ایک جماعت پاکستان دشمن بیرونی طاقت سے مالی امداد حاصل کرتی ہے۔ یہ الزام بڑا سنگین تھا۔ لیکن اس کے بعد ہوا کچھ بھی نہ۔ نہ صرف یہ کہ کچھ بھی نہ ہوا۔ بلکہ اس جماعت کے ذمہ دار ارکان، گذشتہ جنگ

میں سب سے زیادہ قابلِ اعتماد سمجھے گئے۔ وہ حکومت کے ریڈیو پر آئے۔ اخبارات میں ان کے بیان اور تقریریں شائع ہوئیں۔ ان کا لٹریچر ملک میں عام تقسیم ہوا۔ حتیٰ کہ خود حکومت کے شعبۂ اطلاعات کی طرف سے اس کی اشاعت ہوئی۔ آپ سوچئے۔ کہ اس سے لوگ کس نتیجہ پر پہنچے ہونگے۔ اور کیا اس کے بعد حکومت کے اس قسم کے انتباہ کا ان پر کوئی اثر بھی ہو سکتا ہے کہ ملک میں تخریبی عنصر موجود ہے اس سے ہوشیار رہیئے۔ ہم نہ کسی فرد کے خلاف کوئی الزام عاید کرنا چاہتے ہیں۔ نہ کسی جماعت کے خلاف۔ ہم کہنا صرف یہ چاہتے ہیں کہ اگر ملک میں فی الواقعہ کوئی ایسا عنصر موجود ہے تو حکومت کی اولین ذمہ داری ہے کہ ملک کو اس خطرہ سے محفوظ رکھنے کے لئے اس عنصر کا استیصال کرے اور اس گروہ کی واضح نشان دہی کر کے پبلک کو اس سے متنبہ کرے۔

اعلانِ تاشقند کے سلسلہ میں یہ بات بھی سامنے آئی ہے کہ ہندوؤں کی طرف سے یہ مطالبہ پیش ہوا تھا۔ کہ پاکستان اور بھارت کے درمیان جنگ نہ کرنے کا معاہدہ (NO-WAR PACT) ہو جائے۔ صدر مملکتِ پاکستان نے بکمال ہوشمندی اُن کے اس مطالبہ کو مسترد کر دیا۔ یہ بہت اچھا کیا۔ اس سلسلہ میں ہم اس امر کی صراحت ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ قرآن کریم کی رُو سے امتِ مسلمہ" جنگ نہ کرنے کا غیر مشروط" معاہدہ کسی قوم سے نہیں کر سکتی۔ دیگر اقوامِ عالم کے نزدیک جنگ اور صلح کا فیصلہ مصلحت کوشیوں پر مبنی ہے۔ لیکن امتِ مسلمہ کے نزدیک اس کی حیثیت دینی ہے۔ قرآن کریم کی رو سے جماعت مومنین کے سامنے زندگی کا ایک بلند مقصد ہوتا ہے۔ یعنی مستقل اقدارِ وحی کے مطابق زندگی بسر کرنا، جو قوم ان کے اس راستے میں مزاحم ہو، ان کے لئے ضروری ہے۔ کہ اسے سمجھا کر اس تزاحم سے باز رکھنے کی کوشش کریں۔ لیکن اگر وہ اس طرح باز نہ آئیں تو مسلمان قوم پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے اس حق کی مدافعت قوت سے کرے۔ یہ اسلامی جنگ ہے۔ اس جنگ کی صورت میں یہ ہو سکتا ہے۔ کہ دشمن صلح کی درخواست کرے۔ یعنی وہ اپنی مزاحمت سے باز آجائے۔ اگر ایسا ہو تو اس سے صلح کا معاہدہ کر لیا جائے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ جماعت مومنین کسی قوم سے اس قسم کا معاہدہ کر لے کہ جب تک وہ قوم ان کے حق کی مزاحمت نہیں کرے گی۔ وہ ان سے جنگ نہیں کریں گے۔ لیکن ... ترکِ جنگ کا غیر مشروط معاہدہ کسی سے نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ہی جنگ چھڑ جانے کے بعد اسے اس وقت تک بند کیا جا سکتا ہے۔ جب تک امت کے اس حق کی حفاظت نہ ہو جائے ـــــ خواہ یہ دشمن کی طرف سے معاہدۂ صلح کی رو سے ہو۔ اور خواہ اسے شکست دے کر مغلوب کر لینے سے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم

کی رُو سے اقوام متحدہ کا ۲۰ ستمبر کا ریزولیشن یا تاشقند کا اعلان فریق مقابل کی طرف سے معاہدۂ صلح کے اقدام کے مترادف ہے۔ اس لئے اس دوران جنگ کو صرف ملتوی سمجھنا چاہیئے۔ اگر فریق مخالف جنگ کے بغیر ہمارا مطالبہ تسلیم کر لیتا ہے تو ہو المراد۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو پھر قوت کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ مسٹر بھٹو نے اپنے بیان میں یہی کہا ہے ——— لیکن ———

جنگ کے سلسلہ میں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ اس کے لئے امکان بھر تیاری اولین شرط ہے۔ یہ جو کہہ دیا جاتا ہے کہ ہمیں توکل برخدا جنگ شروع کر دینی چاہیئے — یہ جذبات پرستی یا فریب دہی ہے۔ توکل برخدا کا یہ مفہوم نہیں۔ خدا نے ہمیں اس کی تاکید کی ہے کہ ہم اپنی سرحدوں کی ایسی حفاظت کریں جس سے دشمنوں کے دل میں خوف پیدا ہو جائے۔ اتنی تیاری کے بعد آمادۂ جنگ ہونا چاہیئے۔ خود نبی اکرمؐ کی حیات طیبہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ حضورؐ کے دل میں کعبہ کی تولیت کی آرزو، ہجرت کے ساتھ ہی پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن فتح مکہ تک چھ سات سال کا عرصہ لگ گیا۔ اور اس میں حدیبیہ جیسی صلح کا بھی مقام آیا جس کی شرائط سے بظاہر صحابہؓ پر افسردگی تک طاری ہو گئی تھی لیکن اس کے باوجود حضورؐ نے فتح مکہ کی مہم کو ملتوی کر دیا۔ لہٰذا ہمارے لئے اصول یہ ہے کہ — اپنے نصب العین کو سامنے رکھا جائے۔ اس کے حصول کے لئے امکان بھر تیاری جاری رکھی جائے۔ اور اس تیاری کی نسبت سے اس کی طرف بتدریج قدم بڑھایا جائے۔ اپنے نصب العین سے ہٹ جانا، حق سے پھر جانا ہے۔ اور اس کے حصول کے لئے جدوجہد ترک کر دینا جرم۔ اس تک پہنچنے میں ناگزیر تاخیر، قابل مواخذہ نہیں۔

اس سلسلہ میں ایک اور اہم سوال ہمارے سامنے آتا ہے اور وہ ہے غیر مسلموں کے ساتھ ہمارے تعلقات کی نوعیت۔ قرآن کریم نے نوع انسان کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ جو قرآنی آئیڈیالوجی پر ایمان رکھتا ہے۔ اور دوسرا وہ جو اس پر ایمان نہیں رکھتا۔ نیز اس نے باہمی تعلقات کی بھی دو ہی شقیں بتائی ہیں۔ ایک قلبی تعلق جس میں .... کسی قسم کا راز نہیں ہوتا۔ مغائرت نہیں ہوتی — اجنبیت نہیں ہوتی — یہ "من تو شدم تو من شدی" کی مکمل تصویر ہوتے ہیں۔ اس قسم کے تعلقات صرف جماعت مومنین کے افراد میں قائم ہو سکتے ہیں۔ غیر مسلموں کے ساتھ نہیں ہو سکتے — وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ۔ (۹/۷۱)۔ مومن مرد اور عورتیں باہمی

ایک دوسرے سے یگانگت کی دلی دوست داری کے تعلقات رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس تعلقات کی دوسری قسم ہے۔ یہ تعلقات باہمی معاہدات کی رو سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اور ان کا دائرہ اتنا ہی ہوتا ہے جتنا ان کے معاہدات کے اندر آجائے۔ ان سے دوستداری کے تعلقات کی سخت ممانعت آئی ہے۔ ایسی ممانعت کہ قرآن کریم کہتا ہے کہ جو ان سے اس قسم کے تعلقات وابستہ کرے گا وہ مسلمانوں میں سے نہیں بلکہ انہیں (کفار) میں سے سمجھا جائے گا۔ اس نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ

اے جماعت مومنین! تم اپنوں کے سوا کسی کو اپنا راز دار (دوست) مت بناؤ۔ وہ تمہاری تخریب میں کسی قسم کی کمی نہیں کرینگے۔ تمہیں جس قدر تکلیف پہنچتی ہے وہ اس سے اتنے ہی خوش ہوتے ہیں۔ تمہارے خلاف دشمنی کی کچھ باتیں ان کے منہ سے بے ساختہ نکل پڑتی ہیں۔ لیکن جو کچھ ان کے دل میں مخفی ہوتا ہے۔ وہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔

($\frac{۳}{۱۱۸-۱۱۷}$)

— دوسری جگہ ہے۔

مسلمان اپنوں کے علاوہ کسی غیر مسلم کو اپنا دوست نہ بنائیں۔ ان میں سے جو ایسا کرے گا۔ اسے خدا سے کوئی واسطہ نہیں رہے گا۔ ($\frac{۳}{۲۷}$)

دور کے لوگ تو ایک طرف، اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ

اے جماعت مومنین! اگر تمہارے باپ اور بھائی بھی، ایمان کے مقابلہ میں کفر کو ترجیح دیں؛ تو ان سے بھی تم دوستداری کے تعلقات مت قائم کرو۔ جو تم میں سے ایسا کرے گا تو (وہ بھی انہیں جیسا) ظالم ہوگا۔

ان "غیروں" میں جن سے ایسے تعلقات قائم نہیں کئے جا سکتے، کافر، مشرک، اہل کتاب (عیسائی، یہودی) سب شامل ہیں۔ یہود اور نصاریٰ کے متعلق خصوصیت سے الگ بھی ایسا ہی کہا گیا ہے۔ — ($\frac{۵}{۵۱}$) — لہٰذا جو لوگ فرطِ جذبات سے بعض اوقات "ہندو مسلم بھائی بھائی" کا نعرہ بلند کرنے لگ جاتے ہیں۔ انہیں سوچنا چاہیئے۔ کہ وہ خدا کے کھلے ہوئے احکام کی کس قدر خلاف ورزی کرتے ہیں۔ وہ ہمارے بھائی ہو نہیں سکتے۔ ان سے معاہدات کی رو سے تعلقات وابستہ ہونگے۔ اور عدل و انصاف کا سلوک کیا جائے گا۔

ہم یہاں تک لکھ چکے تھے۔ کہ اخبارات میں محترم ذوالفقار علی بھٹو کا طلبا کے نام پیغام شائع

ہوا جس میں انہوں نے ان نونہالانِ ملت کو تلقین کی ہے کہ "وہ اپنی توجہ تعلیم پر مرکوز رکھیں تاکہ مستقبل میں جو فرائض ان کے سپرد ہونگے وہ انہیں خوش اسلوبی سے ادا کر سکیں" اور اس کے ساتھ ہی محترم ملک خدا بخش (وزیر تعلیم مغربی پاکستان) کا یہ اعلان وجہِ اطمینان ہوا کہ حکومت ...... مشفقانہ طور پر غور کر رہی ہے کہ طلباء کے خلاف دائر کردہ مقدمات واپس لے لئے جائیں۔ ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ملک میں کچھ تو ایسے حضرات رہیں جو ان بچوں کو اپنے بچے سمجھتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ہم گھروں کے اندر تو بچوں کو بچے سمجھتے ہیں لیکن جب یہ درسگاہوں میں چلے جاتے ہیں۔ تو وہاں انہیں بچے نہیں سمجھا جاتا۔ حالانکہ گھروں میں اگر یہ اپنے اپنے والدین کے بچے ہوتے ہیں۔ تو گھروں سے باہر یہ ساری قوم کے بچے بن جاتے ہیں۔ آپ دیکھئے کہ اچھے گھروں میں بچوں کے ساتھ کس طرح برتاؤ کیا جاتا ہے ــــ وہاں اگر کسی وقت باپ کسی بچے کو تادیباً سرزنش کرتا ہے۔ تو ماں آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیتی ہے اور اگر کبھی ماں سخت سست کہتی ہے تو باپ اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیتا ہے۔ اگر گھر کا ہر فرد بچے کے خلاف ہو جائے تو بچہ باغی ہو جاتا ہے ــــ اس لئے کہ وہ گھر والوں کی طرف سے مایوس ہو جاتا ہے۔ اور (جیسا کہ ہم پہلے بھی کہہ چکے ہیں) مایوسی کا اگلا قدم سرکشی اور بغاوت ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں قوم کے ان بچوں کے ساتھ سمجھدار اور دردمند ماں باپ کا سا سلوک نہیں ہوتا۔ اگر ایک طرف سے انہیں سرزنش ہوتی ہے تو کوئی ایسا نہیں ہوتا جو آگے بڑھ کر انہیں گلے سے لگا لے۔ جو بظاہر گلے لگانے کے لئے آگے بڑھتے ہیں۔ ان کی کیفیت اس پڑوسن کی سی ہوتی ہے۔ جو گھر سے نکال دیئے ہوئے بچے کو اس لئے گلے سے لگاتی اور پناہ دیتی ہے کہ اسے اسکے ماں باپ کے خلاف ورغلائے اور اس طرح اُن سے اپنی چھپی ہوئی دشمنی کا بدلہ لے۔ ملک کی انتہائی بدقسمتی ہے کہ طلبا کی شورش کے ہنگاموں میں انتظامیہ کا رویہ مشفقانہ نہیں منتقمانہ ہوتا ہے۔ جس سے بچوں کے دل میں سرکشی کے جراثیم اور زیادہ ابھرتے ہیں اور "حزبِ مخالف" کے افراد جب آگے بڑھ کر ان کے سر پر ہاتھ رکھتے ہیں تو اس لئے نہیں۔ کہ انہیں صحیح راستے پر لگا دیا جائے۔ بلکہ اس لئے کہ انہیں برسرِ اقتدار طبقہ کے خلاف اور زیادہ بھڑکا کر اپنے انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کا سامان پیدا کر لیا جائے ــــ یادش بخیر! ہمارے ہاں کا یہ حزبِ مخالف بھی ایک عجیب شے ہے۔ یہ ہر وقت جمہوریت، جمہوریت کا منتر جلتے رہتے ہیں اور جمہوریت کے ابتدائی اصول کو بھی پیشِ نظر نہیں رکھتے۔ انہوں نے جمہوری طریق کے مطابق انتخابات میں حصہ لیا اور شکست کھا گئے۔ اصول و دیانت کا تقاضا یہ تھا کہ یہ اپنی شکست کو مردانہ وار تسلیم کرتے اور اپنے حسنِ عمل اور تعمیری کردار سے قوم کی نگاہوں میں

عزیز بننے کی کوشش کرتے لیکن نہیں — ان کا منصوبہ یہ ہے کہ موقع بہ موقع ملک میں انتشار پیدا کرکے حزبِ اقتدار کو بدنام کرتے جائیے۔ آپ دیکھیں گے کہ ان کے پروگرام میں کوئی تعمیری شق نہیں ہوگی۔ اور یہ ہر وقت تخریبی مواقع کی تلاش میں رہیں گے۔ اور اس کے لئے قوم کے بھولے بھالے اور معصوم طبقہ (طلبا) کو اپنا آلۂ کار بنائیں گے۔ یہ جمہوریت کا نرالہ انداز ہے! اس سے علاوہ دیگر نقصانات، ایک بڑی خرابی یہ بھی پیدا ہوگئی ہے (جو ایسے انداز کا فطری نفسیاتی نتیجہ ہوا کرتی ہے) کہ حزبِ اقتدار کا یہ ردعمل ہوگیا ہے کہ انتشار کے موقع پر ان کی توجہ اس طرف بہت کم جاتی ہے کہ ہم احتسابِ خویش سے یہ معلوم کرلیں کہ اس میں خود ہماری کسی کوتاہی کا تو کوئی حصہ نہیں۔ وہ یہ کہہ کر مطمئن ہوجاتے ہیں۔ کہ یہ ساری خرابی حزب مخالف کی پیدا کردہ ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ..... کہ خرابی کے بنیادی سبب تک کسی کی نگاہ نہیں جاتی۔ اس لئے اس کے ازالہ کی کوشش بھی نہیں کی جاتی۔ اس سے قوم کی حالت یہ ہورہی ہے کہ

دل نے کہا کہ آنکھوں نے ہم کو کیا خراب!
آنکھیں یہ کہتی ہیں ہمیں دل نے ڈبا دیا!
بگڑا کسی کا کچھ نہیں اے میرِ عشق میں
دونوں کی ضد نے خاک میں ہم کو ملا دیا

ایسے ہنگاموں کے وقت، ملک کا پریس بڑا تعمیری فریضہ انجام دے سکتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں کا پریس بھی کچھ عجیب مخلوق بن کر رہ گیا ہے۔ اس کا ایک گوشہ ایسا ہے۔ جس کے متعلق عوام کا تاثر یہ ہے — کہ اس کی کیفیت (غالب کے الفاظ میں) یہ ہے کہ

ہمیں تو خوف ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہیئے!

اور دوسرے گوشے کے متعلق یہ تاثر ہے۔ کہ اس کا وظیفہ ہی یہ کہتے رہنا ہے۔ کہ —
"آٹا گوندھتی کا سر کیوں ہلتا ہے" نتیجہ اس کا یہ کہ ہمارے ملک میں پریس کو کوئی سنجیدگی سے (SERIOUSLY) لیتا ہی نہیں۔

ریڈیو بھی ایسے مواقع پر اچھی خدمت سرانجام دے سکتا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں کے ریڈیو کے ارباب بست وکشاد کی (MORE LOYAL THAN THE KING) بننے کے جذبہ سے کیفیت یہ ہوچکی ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص وہاں سے اتنا بھی کہنا چاہے کہ حکومت کو چاہیئے تھا کہ ریڈیو اسٹیشن کی عمارت شمالاً جنوباً کے بجائے شرقاً غرباً بنواتی، تو وہ اسے بھی حکومت کے خلاف

بغاوت تصور کرتے ہیں ـــ دورِ غلامی کے جراثیم کو تلف ہونے کے لئے بھی نہ معلوم کتنی صدیاں درکار ہوتی ہیں! ـــ لیکن اس کے باوجود، مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ من حیث الکل دیکھا جائے تو ملک کا قدم بہر نوع بہتری کی طرف اٹھ رہا ہے۔ ہمارا مقام پہلے سے زیادہ بلند اور ہمارا سر پہلے سے زیادہ اونچا ہے گذشتہ جنگ نے ہمارے استحکام کی دھاک لوگوں کے دلوں میں بٹھا دی ہے اور تاشقند کانفرنس میں بھی ہم نے کچھ پایا ہی ہے۔ کھویا کچھ نہیں۔ ہمارا اندازہ ہے کہ ہندوستان کے ساتھ ہمارا آخری فیصلہ میدانِ جنگ ہی میں ہوگا۔ اس کے لئے یہ مہلت کا وقفہ بڑا غنیمت ہے۔ اگر ہم نے اس وقفہ سے فائدہ اٹھایا اور اپنی تعمیری جدوجہد کو اسی طرح جاری رکھا تو ہمارے لئے کامیابی یقینی ہے لیکن اس امر کا فیصلہ کہ ہمیں جنگ کب کرنی چاہیئے بہرحال اربابِ حل و عقد ہی بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔ اس لئے کہ اس فیصلہ کا دارومدار بیشتر ایسے امور پر ہوتا ہے جن کا صحیح صحیح علم ہمیں نہیں ہو سکتا۔ اس کیلئے اربابِ حل و عقد کی پاکستان دوستی پر اعتماد نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر ہم مصافِ زندگی کے کسی گوشے میں بھی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔

جیسا کہ ہم نے پہلے بھی لکھا ہے۔ ان سطور کے قلمبند ہونے کے وقت سے لے کر ان کے قارئین کے سامنے آنے تک قریب دو ہفتہ کا عرصہ لگ جائے گا۔ جس طرح حالات اب اعتدال پر آ رہے ہیں۔ اس سے یقین بندھتا ہے۔ کہ اس دوران میں ملک میں کامل سکون عود کر آئے گا۔ اور قوم پھر پہلے کی سی یکجہتی اور اعتماد قلبی کے ساتھ ملک کے استحکام کی مساعی کے لئے کامزن ہو جائے گی خدا کرے کہ ایسا ہی ہو۔

اس دوران میں ہم:

(۱) ملک کے اربابِ بست و کشاد کی خدمت میں، بصد احترام، اقبالؒ کا یہ پیغام پہنچانا چاہتے ہیں۔ کہ:ـــ

بملازمانِ سلطاں خبرے دہم ز رازے
کہ جہاں تواں گرفتن، بہ نوائے دل نوازے

(۲) اپنے عزیز نونہالانِ ملت سے شفقت اور ہمدردی کے انتہائی پُرخلوص جذبات کے ساتھ کہنا چاہتے ہیں کہ جب بھی کوئی انتشار پسند عنصر یا خود اپنا غلط فیصلہ آپ کو کسی تخریبی اقدام کیلئے ابھارے۔ تو اس وقت صرف اتنا سوچ لیا کریں۔ کہ اس تخریب سے نقصان کس کا ہوگا؟ یاد رکھئے کہ اس سے اور کسی کا نقصان نہیں ہوگا۔ خود آپ کا اپنا ہی نقصان ہوگا۔ کہ پاکستان آپ کا ہے۔ اس

کی ہر متاع آپ کی متاع اور اس کا تمام سرمایہ آپ کا سرمایہ ہے۔ آپ ہی اس کے وارث بننے والے ہیں۔ اس لئے اس کا ذرا سا بھی نقصان خود آپ کا اپنا نقصان ہے۔ ایسے غلط اقدامات کے وقت اپنے آپ کو مخاطب کر کے اتنا کہہ لیا کریں۔ کہ

اے چشمِ اشکبار ذرا دیکھ تو سہی!
یہ گھر جو بہ رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو

ہماری دلی آرزو ہے — کہ خدا آپ کو ہر خطرہ سے محفوظ رکھے۔ آپ کے قلب و دماغ کی صلاحیتیں نہایت عمدگی سے بروئے کار ہوں۔ تاکہ کل کو جب آپ ملک کی ذمہ داریاں سنبھالیں تو اس میں آپ کو جو کمی آج نظر آ رہی ہے۔ اسے بہ حسن و خوبی پورا کر سکیں ——— پاکستان کے جواں بخت طالب علمو! یاد رکھو۔ تم میں سے

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

اس سلسلہ سے ہٹی ہوئی ایک اور بات بھی توجہ طلب ہے۔ اگر فوجوں کی واپسی ہوئی — اور ہمیں امید ہے۔ کہ اس باب میں بھی ہم ہندوستان سے دھوکا نہیں کھائیں گے — تو (مثلاً) لاہور میں نہر اور پاکستانی سرحد (واہگہ) کا درمیانی حصہ ہندوستانی فوجوں سے خالی ہو جائے گا جنگ سے پہلے، اس علاقہ میں ہماری سول آبادی بستی تھی۔ اور تجربہ نے بتایا ہے کہ ہندوستان نے جس انداز سے جنگ چھیڑی تھی۔ اس سے سب سے زیادہ نقصان اسی آبادی کا ہوا ہے — اور اسی آبادی کے دوبارہ بسانے کا مسئلہ ہمارے لئے سوہانِ روح بن رہا ہے۔ یہ علاقہ خالی ہو جائے تو ہمیں اس میں اپنی سول آبادی کو دوبارہ ہرگز نہیں بسانا چاہیئے۔ بلکہ سرحد کے قریب کہیں بھی سول آبادی نہیں ہونی چاہیئے۔ یہ اس لئے بھی نہایت ضروری ہے۔ کہ ہمیں واسطہ ہندو جیسی قوم سے پڑ رہا ہے۔ جس کی کسی بات، کسی وعدے، کسی معاہدے، پر قطعاً اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ ہم نے ان کی باتوں پر اعتماد کر کے کافی نقصان اٹھا لیا ہے۔ اب ہمیں ان کے دھوکے میں نہیں آنا چاہیئے۔ تتقوا منھم تقٰۃ۔ (۳/۲۷) خدا کا حکم ہے۔ یعنی ان سے پورا پورا بچاؤ کرو۔

حقائق و عبر

۳۔ رزق کی ذمہ داری

سورۂ ہود کی ایک آیت ہے ۔ وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶) "اور کوئی جاندار روئے زمین پر ایسا چلنے والا نہیں کہ اس کی روزی اللہ کے ذمے نہ ہو" مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے اس آیۂ جلیلہ کی تفسیر بیان فرمائی ہے جو ہفت روزہ شہاب (لاہور) کی ۱۹ ستمبر کی اشاعت میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں وہ پہلے فرماتے ہیں :۔

انسان کے رزق کی کفالت حق تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لے لی ہے اور نہ صرف انسان کی بلکہ زمین پر چلنے والے ہر جاندار کی وہ جہاں کہیں رہتا ہے یا چلا جاتا ہے۔ اس کی روزی اس کے پاس پہنچتی ہے۔ تو کفار کے یہ ارادے کہ اپنے کسی کام کو اللہ تعالیٰ سے چھپالیں۔ جہالت اور بیوقوفی کے سوا کچھ نہیں۔

پھر اس کے عموم میں جنگل کے تمام درندے پرندے اور حشرات الارض۔ دریا اور خشکی کے سب جانور داخل ہیں۔ اس عموم کی تاکید کے لئے لفظ من کا اضافہ کرکے و ما من دابۃ فرمایا ہے۔ دابہ ہر اس جانور کو کہتے ہیں جو زمین پر چلے۔ پرندے جانور بھی اس میں داخل ہیں، کیونکہ ان کا آشیانہ بھی کہیں زمین ہی پر ہوتا ہے۔ دریائی جانوروں کا بھی تعلق زمین سے ہونا کچھ مخفی نہیں۔ اب سب جانداروں کے رزق کی ذمہ داری حق تعالیٰ نے ذمہ لے کر ایسے الفاظ سے اس کو بیان کیا ہے۔ جیسے کوئی فریضہ کسی کے ذمہ ہو۔ ارشاد فرمایا کہ اللہ کے ذمہ ہے اس کا رزق۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ ذمہ داری حق تعالیٰ پر ڈالنے والی کوئی اور طاقت نہیں۔ بجز اس کے کہ اس نے اپنے فضل سے یہ وعدہ فرما لیا۔ مگر وعدہ ایک صادق کریم کا ہے جس میں خلاف ورزی کا کوئی امکان نہیں۔ اسی یقین کو ظاہر کرنے کے لئے اس جگہ لفظ علیٰ لایا گیا ہے۔ جو فرائض کے بیان کے لئے مستعمل ہوتا ہے ؟

اس دعوے کے ثبوت میں (کہ ہر جاندار کے رزق کی ذمہ داری خدا پر عائد ہوتی ہے) انہوں نے ایک

واقعہ بیان فرمایا ہے۔

ایک عجیب جانور

"بعض روایات میں ہے کہ جس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام آگ کی تلاش میں کوہ طور پر پہنچے اور وہاں آگ کی بجائے تجلیات الٰہی سامنے آئیں اور ان کو نبوت و رسالت عطا ہو کر فرعون اور اس کی قوم کی ہدایت کے لئے مصر جانے کا حکم ملا تو خیال آیا کہ میں اپنی زوجہ کو جنگل میں تنہا چھوڑ کر آیا ہوں اس کا کوئی متکفل ہوگا۔ اس خیال کی اصلاح کے لیے حق تعالےٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ سامنے پڑی ہوئی پتھر کی چٹان پر لکڑی ماریں انہوں نے تعمیل حکم کی تو یہ چٹان پھٹ کر اس کے اندر سے ایک دوسرا پتھر برآمد ہوا۔ حکم ہوا اس پر بھی لکڑی ماریں۔ ایسا کیا تو وہ پتھر پھٹا اور اندر سے تیسرا پتھر برآمد ہوا۔ اس پر بھی لکڑی مارنے کا حکم ہوا تو یہ شق ہوا اور اندر سے ایک جانور برآمد ہوا۔ جس کے منہ میں ہرا پتہ تھا۔ آج بھی پہاڑوں کی چٹانوں میں اس کا مشاہدہ ہوتا رہتا ہے کہ ان میں سے جاندار کیڑے نکلتے ہیں۔

حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا یقین تو کوئی نہ ہوتا۔ مگر مشاہدہ کا اثر کچھ اور ہی ہوتا ہے یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام وہیں سے سیدھے مصر کو روانہ ہو گئے۔ زوجہ محترمہ کو یہ بتلانے بھی نہ گئے کہ مجھے مصر جانے کا حکم ہوا ہے وہاں جا رہا ہوں۔"

اس کے بعد مفتی صاحب کے دل میں وہ خیال پیدا ہوا جو ہر اس شخص کے دل میں ابھرتا ہے، جو دیکھتا ہے کہ دنیا میں ہزاروں انسان بھوک سے مر جاتے ہیں تو اس وقت خدا کی یہ ذمہ داری کہاں چلی جاتی ہے؟ وہ فرماتے ہیں۔

> یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہر جاندار کا رزق اللہ تعالےٰ نے اپنے ذمے لیا ہے تو پھر ایسے واقعات کیوں پیش آتے ہیں کہ بہت سے جانور اور انسان غذا نہ ملنے کے سبب بھوکے پیاسے مر جاتے ہیں۔"

سوال بڑا اہم ہے۔ اور اس کا جواب سننے کے لئے یقیناً آپ مضطرب و بیقرار ہوں گے۔ لیجئے۔ جواب حاضر ہے۔ فرماتے ہیں۔

"اس کے جواب علماء نے متعدد لکھے ہیں۔ ایک جواب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ رزق کی ذمہ داری اسی وقت تک ہے جب تک اس کی اجل مقدر یعنی عمر پوری نہیں ہو جاتی۔ جب یہ عمر پوری ہو گی تو اس کو بہر حال مرنا اور اس جہان سے گذرنا ہے جس کا عام سبب امراض ہوتے ہیں۔ کبھی جلنا یا غرق ہونا یا چوٹ اور زخم بھی سبب ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا رزق بند کر دیا گیا اس سے موت واقع ہو گئی۔"

سورہ ھود کی اس آیت کی یہ تفسیر مفتی محمد شفیع صاحب نے بیان فرمائی ہے۔ اس آیت کے متعلق ایک صاحب نے مودودی صاحب سے بھی دریافت کیا۔ اور اپنے سوال میں لکھا کہ

"مجھے جو بات کھٹک رہی ہے وہ یہ ہے کہ جب رزق کا ذمہ دار اللہ ہے تو بنگال کے قحط میں جو تیس ہزار آدمی ۴۴۔۱۹۴۳ء میں مر گئے تھے۔ ان کی موت کا کون ذمہ دار تھا؟"

(ترجمان القرآن۔ جنوری ۱۹۶۶ء)

اب اس سوال کا جواب ملاحظہ فرمایئے۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں:۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ زمین پر جتنی مخلوقات ہیں۔ ان سب کے رزق کا سامان خدا نے پیدا کیا ہے۔ یہ سامان اگر خدا پیدا نہ کرتا تو کون چھوٹے چھوٹے کیڑوں اور بھنگوں سے لیکر نوعِ انسانی تک اس بے حد و بے حساب مخلوق کے لئے ہر ایک کی ضرورت کے مطابق رزق فراہم کر سکتا تھا۔ اب رہی یہ بات کہ مخلوقات میں سے کچھ افراد کبھی رزق نہ ملنے کی وجہ سے بھی مر جاتے ہیں۔ تو اس سے آخر یہ کہاں لازم آتا ہے۔ کہ اللہ تعالےٰ کے رزاق ہونے کا انکار کر دیا جائے؟ اول تو آپ ذرا یہ اندازہ کریں کہ مخلوقات میں سے کتنے فی کروڑ، بلکہ کتنے فی ارب ایسے ہیں جو رزق نہ ملنے کی وجہ سے مر جاتے ہیں۔ دوسرے یہ بھی سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ جس طرح خدا نے اپنی مخلوقات کے لئے زندگی کا بے حد و حساب سامان فراہم کیا ہے۔ اسی طرح اس نے ان کے مرنے کے لئے بھی تو بیشمار اسباب پیدا کئے ہیں۔۔ روزانہ لاکھوں کروڑوں آدمی پیدا بھی ہوتے ہیں اور مرتے بھی ہیں۔ مرنے والے ایک ہی طرح نہیں مرتے بلکہ بیشمار مختلف صورتوں سے مرتے ہیں۔ اور موت کی ان بے شمار صورتوں میں سے ایک صورت رزق نہ ملنا بھی ہے جب موت کا وقت مقرر آ پہنچتا ہے۔ تو اس وقت رزق کی موجودگی بھی کسی متنفس کو موت سے نہیں بچا سکتی۔ صرف رزق ہی نہیں، بلکہ زندگی اور موت کا سامان بھی اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا کے ساتھ یَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا بھی فرمایا گیا۔

مفتی صاحب کی بیان کردہ تفسیر اور مودودی صاحب کے جواب کا ملخص قریب قریب ایک ہی ہے۔ یعنی ان حضرات کا ارشاد یہ ہے۔ کہ ہر فرد کو رزق بہم پہنچانے کی ذمہ واری خدا نے خود لے رکھی ہے لیکن جب کوئی شخص رزق نہ ملنے کی وجہ سے مر جاتا ہے۔ تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے۔ کہ خدا نے اس کی موت ہی ایسے لکھی تھی۔ بالآخر موت کا اختیار بھی تو خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے! اب اگر اس قسم کے دلائل پر

کے بعد بھی کوئی شخص اسلام کا گرویدہ نہ ہو تو اس کی سیاہ بختی کا کیا علاج ؟

لیکن اگر کوئی یہ پوچھ بیٹھے کہ صاحب ! یہ فرمایئے کہ ایک مزدور صبح سے شام تک مزدوری کی تلاش میں مارے مارے پھرتا ہے۔ اسے کہیں مزدوری نہیں ملتی اور وہ شام کو خالی ہاتھ گھر واپس آجاتا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اور اس کے بیوی بچے بھوکے سو جاتے ہیں۔ یا اگر اس کو مزدوری ملتی ہے تو اتنی کہ اس سے ان سب کا پیٹ نہیں بھرتا۔ تو اس کے متعلق کیا کہا جائے گا؟ اس مزدور کے افراد خاندان کو موت تو نہیں آتی۔ لیکن یہ رزق نہ ملنے یا کم ملنے کی وجہ سے سسک سسک کر زندگی کے دن پورے کرتے ہیں۔ تو کیا یہی ہے خدا کی وہ ذمہ واری جس کا اعلان اس نے ایسے واضح الفاظ میں کیا ہے؟ اگر کوئی شخص کسی خاندان کے نان ونفقہ کی ذمہ داری اپنے اوپر لے اور اس کے بعد انہیں اسطرح کھانے کو دے۔ تو کیا آپ کہیں گے کہ وہ اپنی ذمہ واری کو کماحقہٗ پورا کر رہا ہے؟ اقوام متحدہ کے غذائی شعبہ کی رپورٹ یہ ہے کہ اس وقت دنیا کی قریب آدھی آبادی ایسی ہے جسے دو وقت پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا۔ کیا مخلوق کے رزق کی ذمہ واری پوری کرنا اسی کو کہتے ہیں؟

یہ تو ہے ان حضرات کی ذہنی سطح جو اس قسم کے جوابات سے سمجھ لیتے ہیں کہ ہم نے اسلام کی حقانیت اور قرآن کی افضلیت کو دلائل وبراہین کی رو سے ثابت کر دیا ہے اور پھر اس پر یہ اور ان کے عقیدت مند پھولے نہیں سماتے۔ کہ ہم نے کتنا بڑا کارنمایاں کر دکھایا ہے۔

۔۔۔ اب دیکھئے قرآن کریم کے متعلق ان کے مبلغ علم۔ قرآن کریم لوگوں سے بار بار کہتا ہے۔ کہ تم غریبوں اور مسکینوں کو رزق بہم پہنچانے کا انتظام کیوں نہیں کرتے؟ وہ کھلے الفاظ میں کہتا ہے۔ کہ جو شخص يَدُعُّ الْيَتِيْمَ وَ لَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ (۱۰۷/۲) ۔۔۔ یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مساکین کو رزق بہم پہنچانے کے لئے دوسروں کو رغبت نہیں دلاتا ۔۔۔ وہ تکذیب دین کرتا ہے۔ خواہ وہ دکھاوے کی کتنی ہی نمازیں کیوں نہ پڑھے۔ سوال یہ ہے کہ اگر رزق بہم پہنچانے کی ذمہ واری خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہے تو وہ لوگوں سے کیوں کہتا ہے۔ کہ تم بھوکوں کی روٹی کا انتظام کرو۔ اور جو ایسا نہیں کرتے۔ انہیں مستحق عذاب قرار دیتا ہے؟

یہ خیال کہ خدا خود ہر ایک کو رزق پہنچاتا ہے۔ انہی لوگوں کا پیدا کردہ نہیں۔ قرآن کریم بتاتا ہے۔ کہ یہ کن لوگوں کا پیدا کردہ ہے سورہ یٰسین میں ہے۔ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ جب ان سے کہا جاتا ہے۔ کہ جو رزق خدا نے تمہیں دیا ہے۔ اس میں سے محتاجوں اور مسکینوں کے لئے کھلا رکھو۔ یعنی ان کے لئے بھی دو۔ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ

اللہ اَطْعَمَہٗ۔ تو کفار اہل ایمان سے کہتے ہیں۔ کہ ہم ایسے لوگوں کے رزق کا انتظام کیوں کریں۔ کہ اگر خدا چاہتا۔ تو ان کے رزق کا انتظام خود کر دیتا۔ اس کے جواب میں خدا کہتا ہے۔ کہ ان سے کہو۔ کہ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (۳۶/۱۵) تم کھلی ہوئی گمراہی میں ہو۔ یعنی قرآن کریم کی رو سے اس قسم کا عقیدہ — کہ خدا براہ راست رزق پہنچاتا ہے — کفار کا پیدا کردہ اور کھلی ہوئی گمراہی ہے قرآن کی تعلیم کے خلاف، مسلمانوں میں یہ عقیدہ اس وقت آیا جب قرآنی نظام کی جگہ، نظام سرمایہ داری نے لے لی۔ اور اس کی حمایت مذہبی پیشوائیت نے اس قسم کے عقائد پھیلا کر کی کہ — رزق کو خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔ وہ جسے چاہے" بلاحد و نہایت " دولت دیدے۔ جسے چاہے مفلس اور غریب رکھے۔ اگر کسی کو رزق نہیں ملتا تو اُسے سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ خدا کی مشیت ہی ایسی ہے۔ اگر مخلوق بھوکی مرتی ہے تو اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں۔ خدا نے ان کا رزق ختم کر دیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ — اور یہی ہیں وہ عقائد جو ان حضرات کی طرف سے اسلام کے نام سے پھیلائے جاتے ہیں۔

قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ:۔

(۱) رزق کے ذخائر خدا نے بلا مزد و معاوضہ، نوع انسان کی پرورش کے لئے عطا کر دیئے ہیں۔

(۲) ان ذخائر سے رزق نکالنا انسانوں کی سعی و کاوش پر منحصر ہے۔ جو قوم صحیح خطوط پر (خدا کے قوانین طبیعی کے مطابق) محنت اور کوشش کرتی ہے۔ اسے بافراط رزق ملتا ہے۔ جو ایسا نہیں کرتی اس کی روزی تنگ ہو جاتی ہے — اور

(۳) اس طرح پیدا کردہ رزق کی تقسیم، انسانوں کے اجتماعی نظام کی رو سے ہوتی ہے جس نظام میں رزق کی تقسیم اس طرح ہو کہ ہر ایک کو اس کی ضروریات کے مطابق رزق ملتا جائے۔ وہ نظام مشیت خداوندی کے مطابق ہے۔ کیونکہ اس میں خدا کی ذمہ واری پوری ہوتی چلی جاتی ہے جس نظام میں رزق کی تقسیم ناہموار ہوتی ہے — یعنی جس میں بعض لوگوں کے پاس دولت کے انبار کے انبار جمع ہوتے ہیں۔ اور دوسرے لوگوں کو پیٹ بھر کر کھانے کو بھی نہیں ملتا — وہ نظام مشیتِ خداوندی کے مطابق نہیں۔ اس میں " خدا کی ذمہ واریاں " پوری نہیں ہوتیں — یاد رکھئے! انسانی دنیا میں خدا کی ذمہ واری، انسانی نظام کے ہاتھوں پوری ہوتی ہے۔ یہ وجہ ہے کہ حضور نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ " جس بستی میں کسی ایک فرد نے بھی اس طرح صبح کی کہ وہ رات بھر بھوکا رہا۔ اس بستی سے خدا اپنی حفاظت کی ذمہ داری اٹھا لیتا ہے" اور خدا کی ذمہ واریوں کے پورا کرنے کا ہی احساس تھا۔ جس کے لئے حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا۔ کہ " اگر دجلہ کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا مر گیا۔ تو خدا کی قسم عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہو گی "

اگر حضرت عمرؓ بھی اسی اسلام کے حامل ہوتے۔ جو اِس وقت اِن حضرات کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ تو وہ دجلہ کے کنارے 'بھوک سے مر جانے والے کتے کے متعلق نہایت آسانی سے کہہ سکتے تھے۔ کہ جب تک وہ کتا زندہ رہا۔ خدا اسے رزق دیتا رہا۔ جب اس کی موت آگئی۔ خدا نے اس کا رزق بند کر دیا۔ اسکی بھوک کا مجھ سے کیا تعلق جو اسکی باز پرس مجھ سے ہو؛ اور یہی تھا (حضورؐ نبی اکرمؐ کا پیش کردہ) وہ اسلام جسے دیکھ کر قریش کے نظامِ سرمایہ داری کے نمائندہ ابوجہل نے اپنے 'خداؤں' کے حضور فریاد کرتے ہوئے (اقبال کے الفاظ میں) کہا تھا کہ

ایں مساوات ایں مواخات اعجمی است
خوب میدانم کہ سلمان مزدکی است

اور یہی کچھ آج بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن کہا جاتا ہے خود اسلام کا نام لیکر!

آزمائش

جن عقائد کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ جب غریب لوگ اس کی شکایت کریں کہ انہیں اس طرح تڑپا تڑپا کر کیوں مارا جا رہا ہے۔ تو انہیں یہ کہہ کر بہلا دیا جائے۔ کہ اس سے خدا اپنے بندوں کی آزمائش کرتا ہے۔ اس کی مثال بھی (اتفاق سے) ترجمان القرآن کے اسی شمارے میں ہمارے سامنے آئی جس کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے (یعنی جنوری ۱۹۶۶ء کا شمارہ)۔ اس میں ایک صاحب نے (جنکی اہلیہ پانچ چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر انہیں داغ مفارقت دے گئی ہیں) مودودی صاحب کو لکھا۔

> اہلیہ کے انتقال کے فوراً بعد ہی سے یہ سوال دل و دماغ پر مسلط ہو چکا ہے کہ آخر وہ کونسا گناہِ عظیم تھا جس کی پاداش میں مجھے اور میری اولاد کو یہ سزا دی گئی۔ اور اگر یہ واقعی گناہ کا نتیجہ ہے تو میرے معصوم بچوں کو اس میں کیوں شامل کر لیا گیا؟ اس کے جواب میں مجھ سے یہ کہا گیا ہے اور کئی مرتبہ میں بھی اپنے آپ سے یہی کہتا ہوں کہ ہر انسان بہرحال گنہگار ہے۔ اور اپنے گناہوں کی مغفرت کے لئے ہم جتنی بھی اللہ تعالیٰ کے حضور لجاجت سے دعا کریں کم ہے۔ مگر موت کی مصیبت چونکہ اللہ تعالیٰ کے بڑے بڑے نیک بندوں پر بھی جن کی نظیر پیش کرنا شاید ممکن نہیں، آچکی ہے اور اس کے تلخ عواقب سے نہ صرف خود انہیں بلکہ ان کی بے شمار

اولادوں کو بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ لہٰذا یہ حکم لگانا کہ فلاں موقعہ پر موت کا وقوع کسی خاص گناہ یا گناہوں کے کسی خاص مجموعے کی پیداوار تھا۔ غالباً درست نہ ہوگا۔

مزید برآں دعا مانگنے کے بارے میں بھی متعدد ظنون و اوہام پیدا ہو گئے کہ یہ عمل واقعی وہ تاثیر رکھتا ہے یا نہیں جو عموماً اس کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ میں نے اور میرے بچوں نے مرحومہ کی صحت یابی کے لئے سینکڑوں دعائیں کیں مگر نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ اس کے بعد سے میں نے دعا مانگنا ترک تو نہیں کیا مگر منافقت ہوگی اگر میں یہ کہوں کہ اہلیہ کے بارے میں دعاؤں کے رائگاں جانے سے مجھے کمال درجے کی مایوسی نہیں ہوتی۔ میرے بچوں پر اس کا اثر بہت برا ہوا ہے اور وہ دعا کے قائل ہی نہیں رہے۔ پچھلوں دنوں میں نے ان کو اس امر کی ترغیب دلانا چاہی تو وہ مجھ سے کہنے لگے کہ "آپ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ خدا سے دعا کیا کرو۔ وہ سنتا بھی ہے اور قبول بھی کرتا ہے۔ ہم نے اپنی ماں کے لئے بیشمار مخلصانہ دعائیں کیں مگر ایک بھی مستجاب نہ ہوئی۔"

بخلاوہ ازیں سب سے زیادہ ایک پیچیدہ اور تکلیف دہ سوال جو اس سے پیشتر بھی کئی دفعہ پیدا ہو چکا ہے مگر جس کی تلخی اور شدت موجودہ حالات میں کئی گنا زیادہ محسوس ہوئی۔ وہ پیمانۂ عمر کی مقدار اور موت کے مقدر ہونے سے تعلق رکھتا ہے قرآن کریم میں یہ حقیقت بہ صراحت مذکور ہے۔ کہ موت کا وقت معین ہے اور وہ کسی طرح آگے پیچھے نہیں ہو سکتا۔ اس کے بالمقابل مشاہدہ ہمیں بتلاتا ہے کہ خود ہمارے ملک میں جوں جوں علم کی روشنی پھیلتی جا رہی ہے۔ افراد کی اوسط عمر میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اور اہل مغرب کی اوسط عمر مدتوں سے اہل مشرق کی اوسط عمر سے زیادہ رہی ہے۔ اور آج بھی ہے۔ ان حقائق سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عمر کی کمی بیشی شاید ان معنوں میں مقدر نہیں جن معنوں میں ہم اسے مقدر سمجھتے آ رہے ہیں۔ بلکہ انسانی سعی و کوشش بھی عمر کے بڑھانے اور گھٹانے میں دخیل ہے۔ مجھے اس امر کا پورے طور پر احساس ہے کہ یہ سوال جبر و قدر کے عام مسئلہ ہی کا ایک جزو ہی ہے اور اس میں محض استدلال کی مدد سے کسی صحیح نتیجے تک پہنچنا شدید ممکن نہیں۔ مگر جیسا کہ آپ بخوبی جانتے ہیں محض یہ کہہ کر ان مسائل سے اغماض نہیں کیا جا سکتا۔"

آپ نے غور فرمایا۔ کہ ان الفاظ میں ایک قلب مضطر کی دھڑکنیں کس طرح ابھر ابھر کر فریاد طلب

سامنے آئی ہیں. اب اس کا جواب ملاحظہ فرمائیے ۔ مودودی صاحب لکھتے ہیں۔

آپ کی پریشانیوں کا حال معلوم کرکے افسوس ہوا۔ آپ کو اپنی اہلیہ مرحومہ کی وفات کے سبب سے جو اضطراب لاحق ہے۔ اور جس ذہنی کیفیت سے آج کل آپ گزر رہے ہیں۔ اس میں صبر کی تلقین کرنا گویا فطرت سے لڑنے کا مشورہ دینا ہے۔ لیکن درحقیقت اس صورت حال میں صبر کے سوا کچھ بھی انسان کے بس میں نہیں ہے۔ صبر نہ کرے تو اس نقصان کی تلافی بہرحال نہیں ہوسکتی ۔ جو پہنچ چکا ہے۔ صرف اپنی تکلیف میں اضافہ ہوسکتا ہے[1]۔

آپ کا یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ آپ کی اہلیہ کی وفات کوئی سزا ہے جو آپ کو یا آپ کے بچوں کو دی گئی ہے۔ دراصل یہ سزا نہیں بلکہ ان بے شمار آزمائشوں میں سے ایک آزمائش ہے جو دنیا کی اس امتحان گاہ میں انسان کو لازماً پیش آتی ہیں۔ دنیا میں کوئی انسان غیر فانی نہیں ہے۔ ہر ایک کو لازماً کسی نہ کسی وقت مرنا ہے اور موت بہرحال اس شرط کے ساتھ نہیں آتی۔ کہ مرنے والا اپنے پیچھے کوئی ایسا شخص نہ چھوڑے جس کے لئے اس کی موت وجہ پریشانی بن سکے۔ بچے، جوان، بوڑھے سب مرتے ہیں۔ اکثر مرنے والے ایسی حالت میں مرتے ہیں جس سے بہت سے دوسرے انسانوں کے لئے رنج و غم کے علاوہ بہت سی الجھنیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ دنیا کی بہت سی دوسری آزمائشوں کی طرح اس آزمائش سے بھی انسان کو کبھی نہ کبھی ضرور سابقہ پیش آتا ہے۔ اس پر دل برداشتہ ہونے کے بجائے اللہ سے دعا کرنی چاہئے۔ کہ وہ اس سے بخیر گزرنے کی طاقت بخشے اور ان مشکلات کو رفع کردے جو ان سے رونما ہوئی ہیں۔

دعا کے بارے میں بھی یہ سمجھ لیجئے کہ دعا ایک درخواست ہی ہے جو مالک کائنات سے کی جاتی ہے۔ مالک ہر دعا کو قبول کرنے کا پابند نہیں ہے اور نہ وہ اس شرط کے ساتھ مانگنی چاہیئے۔ کہ مالک لازماً اس کو قبول ہی کرے۔ ہمارا کام اس سے صرف التجا کرنا ہے۔ یہ اس کے مالک ہونے اور ہمارے بندہ ہونے کا عین تقاضا ہے۔ وہ قبول کرے تو اس کا کام، نہ قبول کرے تو اس کو اختیار ہے۔ اگر معمولی انسانی حکومتیں بھی ہر سائل کی ہر درخواست کو قبول نہیں کرتیں اور ان کے قبول نہ کرنے کی وجہ بہت سی ایسی

---

[1] خود ہی کہتے ہیں کہ صبر کرنا فطرت سے لڑائی کرنا ہے اور خود ہی صبر کی تلقین کئے جا رہے ہیں۔ (طلوع اسلام)

مصلحتیں ہوتی ہیں جنہیں سائلین نہیں جانتے. تو آخر کائنات کی حکومت کیسے ہماری ہر درخواست کو قبول کر لینے کی پابند ہو سکتی ہے اور کائنات کا یہ نظام کیسے چل سکتا ہے اگر ہر دعا مانگنے والے کی ہر ایک دعا جوں کی توں قبول کر لیجائے۔

پیمانۂ عمر کے بارے میں جو سوال آپ نے کیا ہے اس کا مختصر جواب یہ ہے۔ کہ آج تک کسی تدبیر سے بھی انسان اس پر قادر نہیں ہو سکا ہے کہ ہر انسان کی عمر خود مقرر کر دے اور یہ طے کر دے کہ اس عمر کو پہنچنے سے پہلے کوئی شخص نہ مرنے پائے گا۔ آج تمام انسانی تدبیروں کے باوجود ہر عمر کے آدمی مر رہے ہیں۔ عین ہسپتالوں میں مر رہے ہیں اور ایسے ایسے باوسیلہ آدمی بھی مر رہے ہیں جن کو علاج کی بڑی بڑی ممکن سہولتیں میسر آسکتی ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اعداد و شمار کی بنیاد پر بس یہ دعوے کیا جا سکتا ہے کہ بچوں کی اموات کی شرح کم ہو گئی ہے اور انسانوں کی اوسط عمر میں اضافہ ہو گیا ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ انسان کے ہاتھ میں عمر کا سررشتہ آگیا ہے۔ درحقیقت جسطرح تمام شعبہ ہائے زندگی میں اللہ تعالیٰ بتدریج انسان پر قوانین کائنات کے اسرار کھول رہا ہے۔ اور رفتہ رفتہ اس کو مزید ذرائع پر دسترس عطا کر رہا ہے اسی طرح انسانی امراض کے اسرار بھی وہ اس پر منکشف کرتا جا رہا ہے۔ ان کے علاج کے ذرائع بھی اس کو دیتا جا رہا ہے۔ اور اسی کے مطابق وہ انسان کی تقدیر بھی بدلتا جا رہا ہے لیکن بہرحال تمام دوسرے معاملات کی طرح اس معاملہ میں بھی انسان کی تقدیر ہے خدا ہی کے ہاتھ میں۔ اور آج بھی جب کسی انسان کی موت کا وقت آجاتا ہے۔ تو دنیا کی کوئی طاقت اسے مرنے سے بچا نہیں سکتی۔

میرے خیال میں آپ کو موجودہ ذہنی پریشانی سے نکلنے میں جو چیز سب سے زیادہ مدد دے سکتی ہے وہ قرآن مجید کا غائر مطالعہ ہے۔ اگر میری تفسیر تفہیم القرآن آپ کے پاس ہو تو آپ اس زمانے میں فرصت کے اوقات .... زیادہ تر اس کے مطالعہ میں صرف کریں۔ امید ہے کہ اس سے آپ کو سکونِ قلب حاصل کرنے میں بہت مدد ملے گی۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ جن صاحب نے مودودی صاحب سے یہ سوال کیا تھا اس جواب سے ان کے دلِ دردآگین کو سکون حاصل ہوا یا نہیں۔ لیکن اتنا ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔ کہ اس جواب سے اسلام بیچارہ سر پیٹ کر رہ گیا ہوگا کہ اس کی طرف کیا کچھ منسوب کیا جا رہا ہے۔

بیماری۔ موت، دعا۔ تقدیر وغیرہ ایسے مسائل ہیں جن کی تشریح و تفسیر ضمنی طور پر پیش

کی جا سکے۔ ان موضوعات پر ہم تفصیل سے بہت کچھ کہہ چکے ہیں اور قارئین طلوع اسلام اس سے آگاہ ہیں۔ اس وقت ہم ان چند اشارات پر اکتفا کرتے ہیں۔ کہ

(۱) صحت، بیماری، عمر، کا تعلق خدا کے مقرر کردہ قوانین طبیعی سے ہے اگر ان کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔ تو انسان کی صحت قائم رہتی ہے۔ بیماری کم آتی ہے۔ اور آتی بھی ہے تو اس کی مدافعت آسانی سے ہو جاتی ہے اور اس طرح انسان کی عمر بڑھ جاتی ہے۔ قرآن کریم کی یہی تعلیم ہے اور اس کی تائید اب انسان کے تجربات اور مشاہدات کر رہے ہیں ۔۔۔ موت کا ایک دن مقرر ہے ۔۔۔ شاعرانہ خیال ہے حقیقت نہیں۔ موت کا دن پہلے سے مقرر نہیں ہوتا۔ انسان، اسے خود خدا کے قوانین کے مطابق مقرر کر لیتا ہے۔ کسی کا جی چاہے تو آج ہی اپنے گلے میں پھندا ڈال کر اپنی زندگی ختم کر سکتا ہے۔ آخر الامر موت پر تو انسان قابو نہیں پا سکتا۔ لیکن بیماری پر پا سکتا ہے۔ اور اپنی عمر بڑھا بھی سکتا ہے۔

(۲) خدا کے قانون کی خلاف ورزی کرنے سے جو نقصان رساں نتائج سامنے آتے ہیں۔ (بیماری انہی میں سے ایک ہے)۔ ان کا ازالہ، خدا ہی کے مقرر کردہ دوسرے قانون کی طرف رجوع کرنے سے ہو سکتا ہے (بیماری کی صورت میں صحیح علاج اس کی مثال ہے) یہ خدا کی رحمت ہے کہ اس نے ایسے قوانین عطا کر رکھے ہیں جو تخریبی نتائج کی مدافعت کر سکتے ہیں۔

(۳) خدا کسی کی آزمائش نہیں کرتا ۔۔۔ ایک شخص ہماری دوستی کا دعوےٰ کرتا ہے۔ ہم جاننا چاہتے ہیں کہ وہ اس دعوےٰ دوستی میں سچا ہے یا نہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے۔ کہ ہم اپنی کسی مصیبت میں اس کی طرف رجوع کریں اور دیکھیں کہ وہ کس حد تک اپنے دعوے میں سچا ثابت ہوتا ہے اس سے اس دوست کی آزمائش ہو جاتی ہے خدا کو اس قسم کی آزمائش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ البتہ مصائب و تکالیف کے وقت ہم خود اپنی آزمائش کر لیتے ہیں کہ ہم میں حوصلہ اور ہمت کس قدر ہے اور ہم کس حد تک نامساعد حالات کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ مصائب و تکالیف ہمیں اپنی صلاحیتوں کی پرکھ کرنے کے مواقع بہم پہنچاتی ہیں۔ قرآن کریم میں جس ابتلا کا ذکر آتا ہے اس سے یہی مراد ہے نہ کہ خدا کسی اپنے مقصد کے لئے ہماری آزمائش کرتا ہے۔ خدا کی ذات اس سے بہت بلند ہے۔

(۴) مصائب و مشکلات کا مقابلہ کرنے اور انہیں دور کرنے کے لئے بیشک قرآن کریم کا غائر مطالعہ بہت تقویت بخشتا ہے، کہ وہ خدا کے ان قوانین کی نشاندہی کرتا ہے جن کے مطابق کائنات میں یہ کچھ ہوتا ہے لیکن جن انسانی خیالات کا نام ان حضرات نے قرآنی تعلیم رکھ چھوڑا ہے (خواہ اسے براہ راست پیش کریں یا پہلے قرآن کی کوئی آیت پڑھ کر) ان سے تو ان الجھنوں میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے انکی یہی تعلیم تو ہے جس کی وجہ سے ہمارے زمانے کا غور کرنے والا طبقہ، اسلام سے دور بھاگتا چلا جا رہا ہے۔

ایک چراغ اور لاکھ اندھیرے

[بتقریب یوم پیدائش قائد اعظم رح ۲۵ دسمبر بعد دوپہر، بزم طلوع اسلام لاہور کے زیر اہتمام حسب سابق وائی۔ ایم۔ سی۔ اے ہال لاہور میں جلسہ عام منعقد ہوا جس میں پرویز صاحب نے عنوان بالا پر سامعین سے خطاب کیا۔ تقریر ٹیپ پر ریکارڈ کرلی گئی تھی۔ اب اسے ٹیپ سے از سر نو مرتب کر کے شائع کیا جا رہا ہے۔ (طلوع اسلام)]

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

صدر محترم! میری عزیز بہنو اور بھائیو! سلام و رحمت۔

قرآن کریم نے ایک جگہ کہا ہے۔ کہ عَسٰۤی اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (۲/۲۱۶)۔ ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار گذرے۔ لیکن اس میں تمہارے لئے خیر کے پہلو مضمر ہوں۔ قرآن کریم نے یہ بات جنگ کے سلسلہ میں کہی تھی۔ اور یہ عجب توافق ہے۔ کہ اس کی محسوس تفسیر بھی ہمارے سامنے حالیہ جنگ کے وقت آئی۔ ہماری نئی نسل کے جو بچے تقسیم کے بعد پیدا ہوئے۔ یا جن کے شعور نے پاکستان میں آکر آنکھ کھولی۔ وہ بار بار اعتراض کیا کرتے تھے۔ کہ مسلمانوں نے پاکستان کیوں بنا لیا۔ یہ ہندوستان سے الگ کیوں ہوگئے۔ وہ اتنا وسیع و عریض ملک تھا۔ اس کے وسائل کثیر تھے۔ دنیا کے بڑے بڑے ممالک اس ملک کے ساتھ خوشگوار تعلقات رکھنے پر مجبور تھے۔

نوجوانوں کے اعتراضات

اگر ہم ان کے ساتھ رہتے تو ہمیں یہ آئے دن کی مصیبتیں کیوں بھگتنی پڑتیں۔ یہ تکلیفیں کیوں اٹھانی پڑتیں۔ یہ دشواریاں کیوں پیش آتیں۔ ہم نے ان سے الگ ہو کر خواہ مخواہ اپنے لئے پریشانیاں پیدا کرلیں۔ مفت میں اپنا تکلیف دہ دردسر خرید لیا۔ اگر ہم ان کے ساتھ رہتے تو نہ پانیوں کا سوال پیدا ہوتا۔ اور نہ کشمیر کا مسئلہ ہمارے لئے سوہان روح ہوتا۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ نوجوان اکثر میرے پاس آئے۔ میں پہلے انہیں یہ سمجھانے کی کوشش کرتا کہ آزاد مملکت

کا وجود ہمارے دین کا تقاضا اور ایمان کا مطالبہ تھا۔ ہم غیروں کی محکومی میں اسلامی زندگی بسر کر ہی نہیں سکتے۔ اسلام ایک نظامِ حیات، ایک ضابطۂ زندگی ہے۔ جو اپنے متشکل ہونے کے لئے ایک آزاد خطۂ زمین چاہتا ہے۔ یہ تھی ہمارے مطالبۂ پاکستان کی بنیاد۔ لیکن اسلام کے متعلق جو کچھ وہ مسجدوں اور وعظوں میں سنتے۔ جتنے کہ جو کچھ انہیں اسلامیات کے نام سے پڑھایا جاتا، اس کی روشنی میں میری بات ان کی سمجھ میں نہ آئی — یہ بات ہمارے ہاں کے بڑے بڑے بزرجمہروں کی سمجھ میں نہیں آئی۔ ان بچوں کی، مسجد میں نہ آئے تو اس کا کیا گلہ؟ گلہ تو اس بات کا ہے۔ کہ انہیں پاکستان میں بھی صحیح اسلام سے روشناس نہیں کرایا گیا۔ اگر ان کی تعلیم کی عمارت صحیح بنیادوں پر اٹھتی۔ تو پھر یہ سمجھ سکتے۔ کہ دین اور مذہب میں فرق کیا ہوتا ہے۔ مذہب ہر فضا میں پنپ سکتا ہے۔ بلکہ محکومی و بیچارگی میں وہ اور گہرا اور شدید ہو جاتا ہے۔ اور دین آزاد مملکت کے علاوہ اور کہیں سانس نہیں لے سکتا۔

یہاں سے نیچے اتر کر جب ان نوجوانوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی جاتی۔ کہ ہندو ایسی قوم ہے ہی نہیں جس کے ساتھ کوئی شریف آدمی زندگی بسر کر سکے۔ تو یہ بات پھر ان کی سمجھ میں نہ آئی۔ یہ اس لئے کہ

ہندو کیا ہے

انہوں نے ہندو کو دیکھا ہی نہیں تھا۔ ان کا اس کے ساتھ کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔ ہمارے یہ نوجوان کہتے تھے۔ کہ دنیا میں اور ملک بھی ہیں جن میں مختلف مذاہب اور مختلف نسلوں کے لوگ ایک جگہ آرام سے رہتے سہتے ہیں۔ ہم ہندوؤں کے ساتھ اسی طرح کیوں نہیں رہ سکتے تھے۔ اس جنگ میں ہندو جو بے نقاب ہو کر سامنے آیا۔ تو ہمارے ان نوجوانوں نے پہلی مرتبہ اسے اس کے اصلی خدو خال میں دیکھا۔ اور اس کے بعد خود بخود بغیر کچھ سمجھنے سمجھانے کے پکار اٹھے کہ آپ سچ کہتے تھے۔ اس قسم کے انسانوں کے ساتھ کوئی شریف آدمی نہیں رہ سکتا۔ غالبؔ نے ایک جگہ کہا ہے۔

فغانِ من دلِ خلق آب کرد ورنہ ہنوز!
نگفتہ ام کہ مرا کار با فلاں افتاد!

حقیقت یہ ہے کہ قائد اعظمؒ کی صحیح عظمت بھی اسی وقت سامنے آتی ہے جب یہ معلوم ہو جائے۔ کہ ان کا واسطہ کس قسم کے لوگوں سے پڑا تھا۔ اور کس کس ذہنیت کے دشمنوں سے جنگ کر کے انہوں نے پاکستان حاصل کیا تھا — ان مخالفوں میں ایک طرف ہندو تھا۔ جو اپنی ہزار سالہ غلامی کا انتقام مسلمانوں کو اپنا محکوم رکھ کر لینا چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ دوسری طرف انگریز تھا جس کے سینے میں صلیبی جنگوں کے زخم ابھی تک مندمل نہیں ہوئے — یا یوں کہئے کہ اس نے انہیں ابھی مندمل ہونے نہیں دیا۔ اور وہ اس موقع کی تلاش میں رہتا ہے کہ مسلمانوں کو کس طرح نقصان پہنچایا جائے۔ ان دونوں

مخالفوں کا متحدہ محاذ بھی کچھ کم جرأت آزما اور حوصلہ فرسا نہ تھا۔ جو ان کے ساتھ، خود مسلمانوں کی کئی ایک جماعتیں بھی "شریک جہاد" ہو گئیں ـــ نیشنلسٹ مسلمان، جمعیت العلماء، مجلس احرار، سرخپوش، انصار، جماعت اسلامی، سب تحریک پاکستان کے مخالفوں کی صفوں میں شامل تھے اور ان سب کا مقابلہ اسلام کا یہ سپاہی (قائداعظم) تنہا کر رہا تھا۔

حالیہ جنگ کی علت

ہندوستان اور پاکستان میں جو حالیہ جنگ ہوئی ہے۔ اس کی علت مسئلہ کشمیر کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس مسئلہ کو ہندوستان، اور پاکستان کی نزاع میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لیکن یہ بھی علامات مرض میں سے ایک علامت ہی ہے علت مرض کچھ اور ہے۔ قرآن کریم نے اسلام کے دشمنوں کے متعلق کہا ہے۔ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ۔ وَمَا تُخْفِیْ صُدُوْرُهُمْ اَکْبَرُ۔ (۳/۱۱۷) اسلام دشمنی کی کچھ باتیں بعض اوقات ان کی زبان سے (بے اختیار) نکل جاتی ہیں۔ ورنہ جو کچھ ان کے دلوں میں چھپا ہے۔ وہ ان سے کہیں زیادہ شدید ہے۔ اسی قسم کی ایک بات اگلے دنوں، ہندوستان کے وزیر دفاع مسٹر چوہان کی زبان سے بھی بے اختیار نکل گئی۔ اسے غور سے سنیئے۔ انہوں نے ایک بیان میں کہا ہے کہ

> پاکستان اور ہندوستان کے درمیان اسی دن سے مخاصمت کی بنیاد رکھ دی گئی تھی جس دن پاکستان معرض وجود میں آیا تھا۔ بھارت اور پاکستان کے درمیان آئیڈیالوجی کا اختلاف ہے۔ اس کے سوا کوئی اختلاف نہیں۔ اور یہ اختلاف اور دشمنی ہفتے یا مہینے بھر کی نہیں۔ بلکہ سالہا سال تک رہے گی۔ بھارت کو اس لئے ایک تازہ اور فیصلہ کن جنگ کیلئے تیار رہنا چاہیئے۔

اسی سلسلے میں مسٹر مہاجن نے اگلے دنوں اس حقیقت کا انکشاف کیا تھا کہ دسمبر ۱۹۴۷ء میں بھارت کے نیتاؤں (سربراہوں) کی ایک خفیہ مجلس میں یہ تجویز زیر غور آئی تھی۔ کہ پاکستان پر فوراً حملہ کر دیا جائے۔ مسٹر مہاجن کو افسوس تھا۔ کہ اس تجویز پر اس وقت عمل نہ کیا گیا۔ اور پاکستان کو موقعہ دیدیا گیا۔ کہ وہ اپنی مدافعت کی تیاریاں کرلے، ورنہ معاملہ اسیوقت صاف ہو جاتا۔

یہ تھے برادران عزیز! ان قوموں کے عزائم اور یہ ہے اس جنگ کی بنیادی وجہ۔ یعنی یہ کوئی ہنگامی اختلاف یا عارضی نزاع نہیں۔ یہ وہی کفر و اسلام کی نزاع ہے۔ جو پہلے دن سے چلی آرہی ہے۔ یہ وہی حق و باطل کی کشمکش ہے جو "ازل سے تا امروز" مسلسل جاری ہے اور جاری رہے گی۔

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی، نہ حریفِ پنجہ فگن نئے ؛ وہی فطرتِ اسد اللّٰہی وہی مرحبی وہی عنتری!

ہندی جمہوریت

انگریز ہندوستان سے جا رہا تھا۔ ہندو کا مطالبہ یہ تھا کہ ملک کا اقتدار "اہل ملک" کے سپرد کر دیا جائے۔ تاکہ وہ وہاں جمہوری انداز کی حکومت قائم کر سکیں۔ سطحی طور پر آپ دیکھیں گے۔ تو یہ مطالبہ بڑا معقول اور یہ روش بڑی انصاف پسندانہ نظر آئے گی۔ لیکن اگر آپ سطح سے ذرا نیچے اتر کر دیکھیں گے۔ تو آپ کو نظر آئے گا کہ جمہوریت کے اس معصوم سے جال میں کس قدر "مسلم شکار" لڑیاں پیوست تھیں۔ دنیا میں جہاں جہاں نظام جمہوریت رائج ہے۔ وہاں بالعموم کیفیت یہ ہے۔ کہ سارے ملک میں ایک قوم بستی ہے۔ اس قوم میں مختلف سیاسی پارٹیاں ہوتی ہیں۔ الیکشن میں ایک پارٹی اکثریت حاصل کر لیتی ہے اور زمام اقتدار اس کے ہاتھ میں آجاتی ہے۔ جو پارٹی اقلیت میں رہ جاتی ہے۔ وہ کوشش کرتی ہے کہ مخالف پارٹی کے کچھ ممبروں کو توڑ کر اپنے ساتھ ملا لے۔ اور یوں اپنی اقلیت کو اکثریت میں بدل کر اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اگر وہ اس طرح کامیاب نہ ہو۔ تو وہ آئندہ الیکشن تک کا انتظار کرتی ہے۔ تاکہ اس وقت اکثریت حاصل کر لے۔ اس سے ظاہر ہے۔ کہ اس انداز کی حکومت میں کوئی پارٹی مستقل طور پر برسر اقتدار اور دوسری پارٹی ابدی طور پر محکوم نہیں رہتی۔ اس میں ادل بدل اور اتار چڑھاؤ ہوتا رہتا ہے لیکن ہندوستان میں صورت حالات اس سے یکسر مختلف تھی۔ اس میں ہندو اکثریت میں تھے اور مسلمان اقلیت میں۔ اور ان کی اقلیت کبھی اکثریت میں تبدیل نہیں ہو سکتی تھی۔ (تاوقتیکہ یہ وہاں کے دس پندرہ کروڑ ہندوؤں کو مسلمان نہ کر لیں، جو ناممکن تھا) لہذا ہندوستان کی جمہوری حکومت درحقیقت ہندوؤں کی مستقل حکومت اور مسلمانوں کی ابدی محکومی کے مترادف تھی۔ اس سلسلہ میں ہندوؤں کے عزائم کیا تھے۔ اس کا انکشاف قائد اعظمؒ نے (آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے اجلاس منعقدہ دسمبر ۱۹۴۱ء میں) ان الفاظ میں فرمایا ہے۔

ہندوؤں کے عزائم

ساداکر (صدر مہاسبھا) کی اسکیم یہ ہے۔ کہ جب (انگریز کے چلے جانے کے بعد) میدانی، بحری اور فضائی فوج اور نظم و نسق میں ہندوؤں کو ۵۰ فی صد حصہ مل جائے گا۔ تو پھر ہندو راج قائم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ ان مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا۔ جو شمال مغرب اور شمال مشرق میں بستے ہیں۔ سنیئے وہ (مسٹر مادرک) کہتے ہیں کہ سرحدوں پر ہندو فوج اس طرح بٹھا دی جائیگی جس طرح اب برطانوی فوج متعین ہے۔ اور یہ فوج اس کا خیال رکھے گی کہ مسلمان سر نہ اٹھا سکیں۔

آپ نے اندازہ لگایا — عزیزان من! کہ جمہوری انداز حکومت کے ماتحت، ہندوؤں کے عزائم کیا تھے؟ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ہندوؤں کی متشدد مذہبی جماعت تھی۔ ان کا نیشنلسٹ طبقہ جو کانگریس سے

متعلق تھا۔ وہ ایسا نہیں چاہتا تھا۔ ان کے پیش نظر سیکولر اسٹیٹ کا تصور تھا جس میں کسی خاص گروہ کے مذہبی تصورات کا دوسرے گروہ پر اثر نہیں پڑ سکتا۔ لیکن ایسا کہنے والوں کو اس کا علم نہیں کہ وہاں خود کانگریس کے کیا عزائم تھے۔ اگست ۱۹۳۹ء کا ذکر ہے کانگریس کے جنرل سیکرٹری اچاریہ کرپلانی نے ایک طویل بیان شائع کیا تھا جس میں اس امر کی وضاحت کی گئی تھی۔ کہ کانگریس کے سامنے صرف ملک کے سیاسی

کانگریس کے عزائم

مقاصد نہیں۔ وہ ملک کی معاشرتی زندگی کو گاندھی جی کے فلسفۂ حیات کے مطابق از سر نو متشکل کرنا چاہتی ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے لکھا تھا

"گاندھی جی نے کانگریس کو بتایا۔ کہ ہمارا کام صرف یہ نہیں کہ ملک کی سیاسی باگ ڈور انگریز کے ہاتھ سے چھین کر اہل ملک کے ہاتھ میں دیدیں۔ بلکہ سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ ہم اپنی تمام جدوجہد کی بنیاد کسی ایسے فلسفۂ حیات پر رکھیں۔ جس کے دائرے میں ہماری معاشرت، اخلاق اور روحانیت سب کچھ داخل ہو۔ بالفاظ دیگر ہماری تحریک کو صرف سیاسی نہیں ہونا چاہیئے۔ بلکہ ایسے روحانی اور اعلیٰ فلسفۂ زندگی کے ماتحت ہونا چاہیئے۔ تاکہ اس جدوجہد سے نہ صرف ہماری سیاسی زندگی متاثر ہو۔ بلکہ ہماری زندگی کا ہر شعبہ اس سے اثر پذیر ہو۔ اور ہماری زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو جسے ہم تاریخ کا نیا دور کہہ سکیں۔ زندگی کا یہی وہ نیا باب اور نیا دور ہے۔ جسے گاندھی جی کانگریس کے ذریعے ہندوستان میں لانا چاہتے تھے۔"

یہ تھے **برادرانِ عزیز!** اس کانگریس کے عزائم جسے یکسر سیکولر باڈی سمجھا جاتا ہے۔ یہ گاندھی جی، جن کے فلسفۂ حیات کو ملک کی نئی معاشرتی زندگی کا سنگ بنیاد بنانا مقصود تھا۔ خود کیا تھے۔ اس کے متعلق انہی کی زبان سے سنیئے۔ انہوں نے اپنے اخبار ینگ انڈیا کی ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۱ء کی اشاعت میں لکھا ہے۔

میں اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا ہوں۔ کیونکہ میں ویدوں، اپنشدوں، پرانوں، اور ہندوؤں کی تمام مذہبی کتابوں کو مانتا ہوں۔ اوتاروں کا قائل ہوں اور تناسخ پر عقیدہ رکھتا ہوں۔ میں گئو رکشا کو اپنے دھرم کا جزو سمجھتا ہوں۔ اور بت پرستی سے انکار نہیں کرتا۔ میرے جسم کا رواں رواں ہندو ہے۔

منافقت جنگ کے دوران آپ نے ہندوستان کے وزیر اعظم مسٹر شاستری کی قلابازیوں کا تماشا

دیکھا ہوگا۔ (یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے) ـــــ جو کچھ صبح کے وقت کہا اس کی تردید دوپہر کو کر دی۔ جو کچھ دوپہر کو کہا۔ اس سے شام کو مکر گئے۔ الفاظ ہمیشہ ذو معنی استعمال کئے۔ آج ان کا مطلب کچھ لیا، کل کچھ اور ـــ دھوکا، فریب، غلط بیانیاں: یہ ان کا معمول ہے۔ جو کچھ خود کیا یا کرنا چاہا، پہلے اس کا الزام پاکستان کے سر دھر دیا۔ جانا کسی اور طرف کو ہوا، رُخ کسی اور طرف کا کیا ـــ بتایا کچھ اور، کیا کچھ اور، یہ ہے ان کی سیاست۔ لیکن یہ روش مسٹر شاستری کی طبع زاد نہیں اسے بھی انہوں نے اپنے بزرگوں سے ورثہ میں پایا ہے۔ "مہاتما" گاندھی بھی یہی کچھ کیا کرتے تھے۔ ان کے متعلق قائداعظمؒ نے (مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن۔ جالندھر کے اجلاس ۱۹۴۲ء میں) کہا تھا۔

> ان کا (گاندھی جی کا) مقصد وہ نہیں ہوتا۔ جو وہ زبان سے کہتے ہیں۔ اور جو ان کا مقصد ہوتا ہے وہ کہتے نہیں۔

اسی طرح انہوں نے اگست ۱۹۴۵ء میں ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔ کہ ہمیں جس حریف سے پالا پڑا ہے وہ گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدلتا رہتا ہے۔

> جب ان کے (مسٹر گاندھی کے) مفید مطلب ہوتا ہے تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ کسی کے نمائندہ نہیں۔ وہ محض انفرادی حیثیت سے گفتگو کر رہے ہیں۔ وہ کانگریس کے چار آنہ کے ممبر بھی نہیں رہتے۔ اور جب ضرورت ہوتی ہے تو سارے ہندوستان کے واحد نمائندہ بن جاتے ہیں۔ جب اور حربوں سے کام نہیں چلتا۔ تو مرن برت رکھ لیتے ہیں۔ جب کوئی دلیل پاس نہیں ہوتی تو "اندرونی آواز" کو بدل لیتے ہیں۔ کہیئے کہ ایسے شخص سے ہم کس طرح بات کر سکتے ہیں؟ وہ تو ایک چیستاں ہیں۔ ایک معمہ ہیں۔

ان کی دوررخی کا عالم یہ تھا۔ کہ جنگ عظیم کے دوران جب انگلستان پر دن رات بمباری ہو رہی تھی اور جاپانی کلکتہ تک بڑھ آئے تھے۔ وہ وائسرائے کے ہاں گئے اور کہا کہ جب میں لنڈن پر بمباری کی خبریں پڑھتا ہوں۔ اور وہاں کے جوانوں، بوڑھوں، بچوں، عورتوں پر جو کچھ گذرتی ہے۔ اسے سنتا ہوں۔ تو میری روح کانپ اٹھتی ہے۔ مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی۔ ایسے نازک حالات میں، میں انگریزوں کے لئے ہندوستان میں کسی پریشانی کا موجب نہیں بننا چاہتا۔ میں تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر جنگ کے سلسلہ میں، بلا مشروط تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔ یہ کہتے کہتے ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ وائسرائے بہت متاثر ہوئے۔ ان کی ہمدردی اور تعاون کا شکریہ ادا کیا۔

گاندھی جی نے ادھر یہ کیا اور ادھر کانگریس کی مجلس عاملہ سے ریزولیوشن پاس کرا دیا۔ کہ اگر حکومت

ملک کے اختیارات' کانگریس کی طرف منتقل کرنے کا وعدہ نہیں کرتی۔ تو ہم ملک کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ دیں گے۔ یہاں کے نظم ونسق کو تہ و بالا کر دینگے۔ انگریزوں کو یہاں سے نکال کر دم لینگے۔

اور جب وائسرائے نے گاندھی جی سے پوچھا۔ کہ یہ کیا؟ تو انہوں نے نہایت معصومانہ انداز میں کہہ دیا کہ میرا کانگریس پر کیا بس ہے۔ میں تو اس کا چار آنہ کا ممبر بھی نہیں ہوں۔

آپ سوچیئے۔ برادران عزیز! کہ جس قوم کے "مہاتماؤں" کا یہ عالم ہو۔ اس کے "مسٹروں" کی کیا کیفیت ہوگی؟ اس سلسلہ میں مجھے حال ہی کی ایک دلچسپ بات یاد آگئی۔ آپ کو یاد ہوگا۔ کہ جوڑیاں کے معرکہ

جوڑیاں کی مسجد

کے ضمن میں، آل انڈیا ریڈیو نے یہ خبر نشر کی تھی۔ کہ پاکستانی بمباروں نے صبح کے آٹھ بجے جوڑیاں کی مسجد پر بم گرائے۔ اور پچاس نمازیوں کو شہید کر دیا۔ اور اس کے بعد واویلا مچایا تھا۔ کہ ان لوگوں کو دیکھو! یہ اپنی پرستش گاہوں کو بھی تباہ کرنے سے باز نہیں آتے۔ اول تو آپ دیکھئے کہ صبح کے آٹھ بجے کون سی نماز ہوتی ہے جس میں پچاس نمازی شہید ہو گئے؟ پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ میں پرسوں جوڑیاں کی مسجد میں تھا۔ وہ اتنی چھوٹی ہے کہ اس میں پچاس آدمی بیک وقت بمشکل کھڑے ہو سکتے ہیں۔ وہاں ہمیں بتایا گیا۔ کہ جب جوڑیاں پر پاکستانیوں نے قبضہ کیا ہے تو یہ مسجد نہایت خستہ اور خراب حالت میں تھی۔ اور اس میں ایک موچی بیٹھتا تھا۔ اسے مسجد کی شکل دوبارہ ہماری فوج کے سپاہیوں نے دی ہے۔

اور آگے بڑھیئے۔ اس مسجد پر (افسانوی) بم باری کی خبر نشر کر کے' بھارتیوں نے یہ تاثر بھی پیدا کرنا چاہا۔ کہ انہیں دوسرے مذاہب کی پرستش گاہوں کا بڑا احترام ہے لیکن آپ کو معلوم ہے۔ کہ اس وقت

ہندوستان کی مساجد

ہندوستان میں مسلمانوں کی مساجد کی حالت کیا ہے۔ یہ میرے سامنے ہندوستان کے اخبار مدینہ کی ۲۸ جولائی ۱۹۶۵ء کا پرچہ ہے۔ اس میں لدھیانہ سے شائع ہونے والے (ہندوؤں کے ایک اخبار) ترجمان کے حوالے سے ایک دلچسپ خبر درج ہے۔ اس میں لکھا ہے۔ کہ ایک مسجد پر ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ اس کے ایک کمرے پر ایک سکھ نے قبضہ جما لیا۔ ہندوؤں نے اسے بے دخل کرنا چاہا۔ تو اس نے مسلم اوقاف بورڈ سے کہہ کر' ہندوؤں کیخلاف مقدمہ دائر کرا دیا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اخبار ترجمان نے کہا ہے کہ اس سکھ سردار کو ایسا کرتے وقت ذرا خیال نہ آیا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے۔ کہ۔

اس شہر کی ۱۱۷ پرانی مسجدوں میں سے ۹۰ میں گوردوارے قائم ہیں۔ اور صرف ۱۵، ۱۶ میں مندر۔ باقیوں میں رہائش ہے۔

یہ ہے برادران عزیز! ہندوستان کی سیکولر اسٹیٹ میں مسلمانوں کی مساجد کی حالت ۔ اُس سیکولر اسٹیٹ میں، جس کے نمائندوں کو جوڑیاں کی مسجد کی "تباہی" سے اس قدر صدمہ ہُوا ہے۔

برطانیہ اور پاکستان

یہ تو تھا ہندو ۔۔۔ اب اس محاذ کے دوسرے فریق "انگریز" کو لیجئے۔ تحریک پاکستان کے دوران ہندوؤں نے بڑی شدّ و مد سے پراپیگنڈہ کر رکھا تھا۔ کہ تقسیم ہند کی اسکیم انگریز کی پیدا کردہ ہے۔ اور جناحؒ انگریز کے اشارے پر تشکیل پاکستان کی تحریک چلا رہا ہے ۔۔۔ ہندو تو ایک طرف خود پاکستان میں ابھی تک ایسے لوگ موجود ہیں، جو اس خیال کو عام کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ کہ پاکستان کا تصور برطانیہ کی پیدا کردہ سازش تھی ۔۔۔ اور قائد اعظمؒ انگریز کا آلۂ کار تھا۔

لیکن سنیئے! کہ تحریک پاکستان کے دوران انگریز مسلمانوں کے خلاف کیا کچھ کر رہا تھا۔ اور اس محاذ میں ہندو اور انگریز دونوں کس طرح مسلمانوں کے خلاف شانہ بشانہ لڑ رہے تھے۔ انگریز مسلمانوں کے خلاف کیا کرنا چاہتا تھا۔ اس کے متعلق قائد اعظمؒ نے (سندھ مسلم لیگ کی سالانہ کانفرنس میں، اکتوبر ۱۹۳۸ء میں) کہا تھا۔ کہ

> برطانیہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھیڑیوں کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں۔ کہ برطانیہ سے وہی بازی لے جا سکتا ہے۔ جس میں قوت ہو۔ لیکن ہم ہندو اور برطانیہ دونوں سے لڑینگے۔

پھر انہوں نے فروری ۱۹۴۰ء میں لیگ کونسل کے اجلاس میں کہا تھا۔

> برطانیہ عظمیٰ ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتا ہے۔ مسٹر گاندھی اور کانگریس مسلمانوں پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم نہ برطانیہ کو مسلمانوں پر حکومت کرنے دینگے نہ ہندو کو۔ ہم آزاد رہنا چاہتے ہیں۔

مارچ ۱۹۳۹ء میں مرکزی اسمبلی میں ایک ایسا بل پیش ہُوا جس سے مسلمانوں کے حقوق کی سخت پامالی ہوتی تھی۔ اس بل پر تقریر کرتے ہوئے قائد اعظمؒ نے کہا۔

> میں انگریز اور ہندو دونوں کو متنبہ کر دینا چاہتا ہوں۔ کہ تم الگ الگ یا دونوں متفق ہو کر بھی، ہماری روح کو فنا کرنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکو گے۔ نہ تم اس تہذیب کو مٹا سکو گے جو ہمیں ورثہ میں ملی ہے۔ ہمارا نور ایمان زندہ ہے۔ زندہ

رہا ہے اور زندہ رہے گا۔ تم ہم پر ظلم و ستم کرو۔ ہمارے ساتھ بدترین سلوک کرو ہم ایک فیصلہ پر پہنچ چکے ہیں۔ اور ہم نے یہ عزم کر لیا ہے۔ کہ ہم لڑتے لڑتے مر جائیں گے۔

انہوں نے ۱۹۴۲ء میں یوم پاکستان کی تقریب پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

اگر ہندو قیادت یا برطانوی قیادت۔ الگ الگ یا دونوں متحد ہو کر ہمارے خلاف فریب کاریوں اور سازشوں پر اتر آئیں۔ تو ہم اس کی مدافعت کریں گے۔ تا آنکہ ہم ایک ایک کر کے کٹ کر مر جائیں۔

انہوں نے ۱۹۴۵ء میں پشاور کے ایک جلسہ عام میں فرمایا۔

ہمارا کوئی دوست نہیں۔ ہمیں نہ انگریز پر بھروسہ ہے نہ ہندو پر۔ ہم دونوں کے خلاف جنگ جاری رکھیں گے۔ خواہ وہ آپس میں متحد بھی کیوں نہ ہو جائیں۔

متحدہ سازش

اس زمانے میں چین میں جنرل چیانگ کائی شک برسر اقتدار تھے جن کے پنڈت جواہر لال نہرو سے بڑے گہرے مراسم تھے اور دوسری طرف ان کا امریکہ پر بھی بڑا اثر تھا۔ ان سب کی تجویز یہ تھی کہ ہندوستان کے مسئلہ کو کسی طرح اقوام متحدہ میں لے جایا جائے۔ اس پر قائداعظم ؒ نے نومبر ۱۹۴۱ء میں علیگڑھ یونیورسٹی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

چین اور امریکہ کی متحدہ قوت بھی ہم پر کوئی ایسا دستور مسلّط نہیں کر سکتی جس میں مسلمانوں کو قربان کر دیا گیا ہو۔ اگر متحدہ اقوام کسی ایسی احمقانہ حرکت کا ارتکاب کر بیٹھی تو اسے معلوم ہو جانا چاہیئے کہ اپنی حفاظت کے لئے ایک چیونٹی بھی پلٹ کر حملہ کر دیا کرتی ہے۔ ان غیر ملکی سنگینوں کی پروا نہ کرتے ہوئے جن کے سائے میں کانگریس راج رچایا جا رہا ہوگا ہم ملک کے سارے نظام میں زلزلہ ڈال دیں گے اور اسے معطل کر کے رکھ دیں گے۔

کیبنٹ مشن

۱۹۴۶ء میں کیبنٹ مشن ہندوستان آیا۔ حکومت برطانیہ نے اعلان کیا کہ جو پارٹی اس مشن کی تجاویز کو قبول کر لے گی اسے تشکیل حکومت کا موقع دیا جائے گا۔ کانگریس نے اس مشن کی تجاویز کو نہ قبول کیا نہ مسترد۔ لیکن مسلم لیگ نے انہیں قبول کر لیا۔ اور آپ یہ سنکر حیران ہوں گے۔ کہ حکومت برطانیہ اپنے وعدہ سے صاف مکر گئی۔ اور لیگ کو تشکیل حکومت کا موقع نہ دیا۔ اس پر قائداعظم نے (مسلم لیگ کونسل کے اجلاس لکھنؤ میں) کہا :-

ہم بحث وتمحیص کرتے تھک گئے ہیں۔ کسی سے مدد مانگنا بے سود ہے۔ دنیا میں کوئی بھی عدالت نہیں جس سے ہم دادخواہی کر سکیں۔ ہماری آخری عدالت ملتِ اسلامیہ ہے اور ہم اسی کے فیصلے کی پابندی کرینگے۔

پھر انہوں نے جولائی ۱۹۴۶ء میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

ہم جانتے ہیں کہ برطانیہ کے پاس مشین گنیں ہیں۔ وہ اپنی طاقت کو جس طرح چاہیں استعمال کریں۔ دنیا کی کوئی عدالت نہیں جس کے پاس ہم اس کے خلاف اپیل کر سکیں گے۔ دوسری پارٹی کانگریس ہے وہ پوری طرح دوسری قسم کے ہتھیاروں کو استعمال کریگی۔ اس لئے اب ہم اپنے حفظ و بقا کے لئے آئینی طریقوں کو خدا حافظ کہنے پر مجبور ہیں اور اب ہم نے طے کر لیا ہے کہ براہِ راست اقدام کی تیاریاں اور عمل ہماری پالیسی اور پروگرام کا جزو ہوگا۔

اور اگست ۱۹۴۶ء میں بتقریب عید قوم سے کہا۔ کہ

مسلم ہندوستان کو برطانیہ کی بدعہدیوں اور وعدہ خلافیوں نے ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ ہم نے اگست ۱۹۴۰ء کے اعلان کے مطابق ان سے یہ وعدہ لے لیا تھا۔ کہ جب تک ہندوستان کی بڑی سیاسی جماعتوں اور قومی زندگی کے دوسرے اہم عناصر میں کوئی سمجھوتہ نہ ہو جائے۔ حکومت کے اختیارات کسی ایک پارٹی کے نام منتقل نہیں کئے جائیں گے۔ اس اعلان میں یہ بھی تحریر ہے کہ جب تک ہندو مسلم سمجھوتہ نہ ہوگا — ہندوستان کے لئے کوئی نیا آئین متشکل نہیں ہوگا۔ لیکن آج حکومتِ برطانیہ نے اس صاف اور واضح اعلان کے پرزے پرزے کر دیئے ہیں۔

یہ تھا برادرانِ گرامی قدر! برطانیہ کا رویہ ہمارے ساتھ اور قائد اعظمؒ کو ان دونوں سے برسرِ پیکار ہونا پڑا تھا۔

قتل وغارت گری

جب ہندوؤں نے دیکھا کہ وہ مسلمانوں سے آئینی بازی نہیں لیجا سکتے۔ تو وہ ان حربوں پر اتر آئے جو اس قسم کے دشمن کی ذہنیت کا آخری مظاہرہ ہوتا ہے۔ انہوں نے ان صوبوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے۔ فسادات برپا کرنے شروع کر دیئے اور اس طرح مسلمانوں کے جان، مال، عزت، آبرو کو تباہ کرنے لگے۔ پہلے بمبئی میں فسادات کرائے۔ پھر یو۔پی میں اور آخر میں بہار میں وہ قتل وغارت گری شروع کر دی جس کی مثال ہلاکو اور چنگیز خان کی بے محابا خونریزیوں

اور آتش فشانیوں میں بھی نہیں ملتی جن صوبوں میں مسلمان اکثریت میں تھے۔ جب یہ خبریں وہاں پہنچیں۔ تو لازمی تھا۔ کہ اس سے ان کا خون کھول جاتا۔ وہ اس پوزیشن میں تھے کہ اپنے مظلوم بھائیوں کے خون کا بدلہ یہاں کے ہندوؤں سے لے لیں۔ کہا جاتا ہے۔ کہ "جنگ اور محبت میں ہر حربہ جائز ہوتا ہے۔" لیکن یہ کچھ ان کے ہاں جائز ہوتا ہے۔ جن کے سامنے زندگی کی کوئی مستقل اقدار نہیں ہوتیں۔ قائداعظم کی ساری جنگ اپنی مستقل اقدار کے تحفظ اور استحکام کے لئے تھی۔ ان کے مطالبۂ پاکستان کی بنیاد اس دعوے پر تھی۔ کہ ہم ایک ایسا خطۂ زمین چاہتے ہیں۔ جس میں ہم اپنی ان اقدار کو فروغ دے سکیں اور ان کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔ اس لئے وہ کب روا رکھ سکتے تھے کہ بہار کے مسلمانوں کے قتل عام کا انتقام پنجاب کے ہندوؤں سے لیا جائے۔ انہوں نے ۱۱ نومبر ۱۹۴۶ء کو اپنی قوم کے نام ایک ضبط انگیز اپیل شائع کی۔ جس میں کہا کہ:-

> میں خدائے عظیم سے دعا کرتا ہوں کہ مسلمان کے دامن پر وہ بدنما داغ نہ لگے جس کا مظاہرہ مظلوم مسلمانوں پر انسانیت سوز مظالم کر کے بہار میں کیا گیا ہے۔ ہمیں تہذیب و شرافت کو کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ مسلمانوں پر جو ظلم ہو رہے ہیں۔ ان سے ہمارا کلیجہ چھلنی ہو رہا ہے۔ لیکن ہم مسلم اکثریت والے صوبوں میں بے گناہوں کو مار کر اپنا دل ٹھنڈا نہیں کریں گے۔ میں مسلمانوں سے بزور اپیل کروں گا۔ کہ وہ جہاں بھی اکثریت میں ہوں۔ غیر مسلموں کی حفاظتِ جان اور مال کے لئے جو کچھ بھی ممکن ہو کریں۔ اقلیت والے صوبوں میں مسلمانوں پر جو مظالم توڑے گئے ہیں۔ جو بے گناہ مسلمان شہید کئے گئے ہیں۔ یا زخمی ہوئے ہیں یا مال اسباب لوٹا گیا ہے۔ ان کی قربانی رائیگاں نہیں جائے گی۔ وہ سمجھ لیں کہ انہوں نے جنگِ پاکستان اور آزادی کے لئے اپنا حق ادا کر دیا ہے۔

یہ تھی برادرانِ عزیز! قائداعظمؒ کی وہ عظمتِ کردار۔ جس کی قوت سے انہوں نے اس عظیم جنگ کو جیتا تھا۔

اس محاذ میں تیسرا فریق مخالف، خود مسلمانوں کے وہ گروہ تھے۔ جو تحریکِ پاکستان کی مخالفت میں ہندوؤں سے بھی چار قدم آگے تھے ــــ نیشنلسٹ مسلمان، جمعیت العلماء (مولانا آزاد۔ مولانا مدنی، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید۔ وغیرہ) احرار، مسلم مجلس۔ انصار، سرخپوش، جماعت اسلامی ــــ انہوں نے اس مطالبہ کی مخالفت میں کیا کچھ کیا۔ اب اس کے تذکرہ سے کیا حاصل!

سفینہ جب کہ کنارے پہ آ لگا غالبؔ
خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کہیئے!

آخری سازش

ان سب کے علی الرغم، قائد اعظمؒ نے یہ جنگ جیت لی اور ہندوستان تقسیم ہو گیا۔ لیکن ہم منزل پر پہنچ کر ایک ایسی سازش کا شکار ہو گئے جس کے لگائے ہوئے زخم ابھی تک مندمل نہیں ہو سکے ___ بلکہ یوں کہیے کہ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے، وہ سرطان (کینسر) کی طرح پھیلے چلے جا رہے ہیں۔

تقسیم ہند کے سلسلہ میں اصول یہ طے پایا تھا کہ جن علاقوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں وہ پاکستان کا حصہ قرار پائیں گے۔ یہ اصول انگریز اور ہندو دونوں نے تسلیم کیا تھا۔ لیکن اس کے بعد پہلے تو اس قسم کی سازشیں شروع ہوئیں۔ کہ سرحد جیسے علاقہ میں جہاں مسلمانوں کی آبادی نوّے فیصد سے کم نہ تھی ___ استصواب رائے کرایا گیا (کہ وہ ہندوستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان کے ساتھ)۔ خدا خدا کرکے یہ مرحلہ طے ہوا۔ تو یہ چال چلی گئی کہ ملک اصولی طور پر تقسیم پہلے ہو جائے اور حد بندی بعد میں ہو۔ اور اس حدود بندی کا فیصلہ (ARBITRATION) یعنے ثالثی کی رُو سے ہو۔ آج اتنے عرصہ کے بعد ہم نہیں کہہ سکتے کہ قائد اعظمؒ کے پیش نظر وہ کون سی مصلحتیں تھیں یا وہ کن دشواریوں میں گھرے ہوئے تھے کہ انہوں نے ایسے بنیادی مسئلہ میں انگریز کی ثالثی قبول کرلی۔ لیکن اس کا نتیجہ بہرکیف یہ ہوا۔ کہ ہم نے جیتی ہوئی بازی ہار دی۔ گورداسپور کا ضلع مسلم اکثریت کا علاقہ تھا۔ اور کسی کو اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا، کہ یہ ضلع ہندوستان کے ساتھ ملا دیا جائیگا۔ اس ضلع کی اہمیت کا اس سے اندازہ لگائیے کہ اگر یہ پاکستان کے ساتھ ملا دیا جاتا۔ تو کشمیر کا مسئلہ پیدا ہی نہ ہوتا۔ یہی وہ ضلع ہے جس سے ہندوستان کو کشمیر کی طرف جانے کا راستہ ملا۔ صاف نظر آتا ہے کہ ہندو اور انگریز دونوں کے پیش نظر اس وقت کشمیر کا الحاق تھا۔ اس کے لئے کیا یہ گیا کہ اس ضلع کو ہندوستان کے ساتھ ملا دیا اور اسی سے یہ سارے مسائل پیدا ہو گئے جو مسلسل اٹھارہ سال سے ہمارے لئے وجہ سوہان روح بن رہے ہیں۔ اور نا معلوم کب تک بنتے چلے جائیں گے۔ یہ وہ آخری تحفہ ہے جو ہمیں انگریز جاتے جاتے دے گیا۔ اس فریب کاری کا ذکر قائد اعظمؒ نے اگست ۴۷ء ۱۹ میں لاہور کی ایک تقریر میں ان الفاظ میں کیا۔

> ہم جانتے ہیں کہ ہمارے ساتھ کیسی کیسی بے انصافیاں اور زیادتیاں روا رکھی گئی ہیں۔ تقسیم کا کام ختم ہو چکا ہے اور ہمارے علاقے کو جس قدر کم کیا جا سکتا تھا کر دیا گیا باؤنڈری کمیشن کا فیصلہ نہ صرف غیر منصفانہ ہے بلکہ بدنیتی پر بھی مبنی ہے۔ اسے قانونی فیصلہ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ سیاسی فیصلہ ہے۔ بہرحال اب فیصلہ ہو چکا ہے۔ ہم نے جو وعدے کئے ہیں۔ انہیں ہم پورا کریں گے۔ ہم اپنے الفاظ پر قائم ہیں۔

یہ سب سازشیں کس مقصد کے لئے کی جا رہی تھیں۔ اس کی غمازی لارڈ ایٹلی (جو اس وقت میجر ایٹلی تھے اور برطانیہ کے وزیراعظم) کی وہ تقریر کرتی ہے۔ جو انہوں نے پارلیمان میں (INDEPENDENT BILL) پیش کرتے وقت کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا۔

> ھندوستان تقسیم ہو رہا ہے۔ لیکن مجھے امید واثق ہے کہ یہ تقسیم زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکے گی۔ اور یہ دونوں مملکتیں جنہیں ہم اس وقت الگ الگ کر رہے ہیں۔ ایک دن پھر آپس میں مل کر رہیں گی۔
>
> (پاکستان ٹائمز ۱۵ ۴۷/۷)

برطانیہ کا وزیراعظم یہ کہہ رہا تھا۔ ھندو، پاکستان پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہا تھا ——— اور قائداعظمؒ لارڈ مونٹ بیٹن سے کہہ رہے تھے کہ

> ہم کوشش کریں گے۔ کہ دولتِ برطانیہ، ھندوستان، اور ھمسایہ حکومتوں سے ہمارے تعلقات خوش گوار رھیں۔

ضمناً یاد آگیا ——— جب لارڈ مونٹ بیٹن، ۱۳ اگست ۱۹۴۷ء کو انتقال اختیارات کے سلسلہ میں کراچی آیا ہے۔ تو اس نے پاکستان کے گورنر جنرل (قائداعظمؒ) سے کہا تھا۔ کہ پاکستان کو حکومت مل رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جہاں تک غیر مسلم اقلیتوں کا تعلق ہے۔ پاکستان شاہنشاہ اکبر کی (رواداری کی) پالیسی پر عمل کرے گا۔ اس پر قائداعظمؒ نے جھٹک کر جواب دیا۔ کہ ہمیں اس تلقین کی ضرورت نہیں۔ ہم ان روایات کے حامل ھیں جن کی رو سے ھمیں غیر مسلموں کے ساتھ رواداری ہی کا نہیں بلکہ فیاضانہ سلوک کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

خراجِ تحسین یہ تھا برادرانِ عزیز! ملتِ اسلامیہ کا وہ چراغ جس نے لاکھ اندھیروں کا مقابلہ کیا۔ اور کامیاب و کامران دنیا سے رخصت ہوا۔ ان کی وفات پر دنیا کے عظیم سیاست دانوں اور مفکروں نے ان کی بارگاہ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ حتےٰ کہ لنڈن ٹائمز جیسے اخبار نے لکھا ہے۔

> انہوں نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونہ پیش کر کے اپنے اس دعوے کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہے۔ ان میں وہ ذہنی لچک نہیں تھی۔ جو انگریز کے نزدیک ہندوستانیوں کا خاصہ ہے۔ ان کے خیالات ہیکر کی طرح قیمتی مگر سخت، واضح اور بیّن ہوتے ہیں۔ ان کے دلائل میں ھندو لیڈروں جیسی حیلہ سازی نہ تھی۔ بلکہ وہ جس نقطۂ نظر کو ہدف بناتے تھے۔ اس پر براہ راست نشانہ باندھ کر وار کرتے تھے۔ وہ

ایک ناقابل تسخیر حریت تھے۔

غیب تو یہ کہہ رہے تھے لیکن کس قدر مقامِ تاسف ہے کہ "خود" اپنے "—— جو ہندوستان سے بھاگ کر پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اور پاکستان نے انہیں ان کی مسلسل مخالفت کے باوجود، نہایت کشادہ ظرفی سے پناہ دی تھی —— اسی قائد اعظمؒ کے متعلق یہ زہرافشانی کر رہے تھے کہ

> اس پورے گروہ میں ایک کوہ کن بھی نہ نکلا جو بازی کھو دینے کے بعد سر دے سکتا۔ ساری جماعت بازی گردوں سے پٹی پڑی تھی جنہوں نے عجیب عجیب قلابازیاں کھا کر دنیا کو اپنی بودی سیرت اور کھوکھلے اخلاق کا تماشا دکھایا۔ اور اس قوم کی رہی سہی عزت خاک میں ملا دی جس کے وہ نمائندے تھے۔
>
> (ترجمان القرآن اگست ۱۹۴۸ء)

بسترِ مرگ سے

ایسا نظر آتا ہے کہ قائد اعظمؒ کو اپنی زندگی کے آخری ایام میں ہندوستان کے مذموم عزائم کا اندازہ ہو گیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بسترِ مرگ سے کہا تھا۔

> خدائے عظیم و برتر کی قسم جب تک ہمارے دشمن ہمیں اٹھا کر بحیرہ عرب میں نہ پھینک دیں ہم ہار نہ مانیں گے۔ پاکستان کی حفاظت کے لئے میں تنہا لڑوں گا۔ اس وقت تک لڑوں گا جب تک میرے ہاتھوں میں سکت اور میرے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی موجود ہے۔ مجھے آپ سے کہنا ہے کہ اگر کوئی ایسا وقت آ جائے کہ پاکستان کی حفاظت کے لئے جنگ لڑنی پڑے تو کسی صورت میں ہتھیار نہ ڈالیں پہاڑوں جنگلوں اور دریاؤں میں جنگ جاری رکھیں۔
>
> (ڈاکٹر ریاض علی شاہ کی کتاب۔ "قائد اعظمؒ کے آخری ایام")

سترہ سال کے بعد —— بالآخر وہ وقت بھی آ گیا، اور للہ الحمد کہ ہماری فوجوں نے قائد اعظم کی توقعات کو پورا کر دکھایا۔ وہ اس وقت زندہ ہوتے تو اپنے ان شاہین بچوں پر بڑا فخر کرتے۔ نہ صرف

ہمارے فوجیوں کے کردار

اس لئے کہ انہوں نے میدان کارزار میں بے مثال جرأت —— اور بہادری کا ثبوت دیا ہے۔ بلکہ اس لئے بھی کہ انہوں نے سخت آزمائش کے وقت اپنی ان اخلاقی روایات کو قائم رکھا ہے جس کی تلقین سانحۂ بہار کے سلسلہ میں مسلم اکثریت کے صوبوں سے کی تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ حالیہ جنگ میں جہاں ہندوؤں نے نہتی شہری آبادیوں کو

تباہ و برباد کیا۔ وہاں ہماری عصمت وعفت پر بھی ڈاکے ڈالے۔ وہ ہماری جوان بیٹیوں کو ٹرکوں میں بھر کے لے گئے۔ ہمارے جانباز، غیور، باہمت سپاہیوں نے ان مناظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ اس کے بعد انہی سپاہیوں کا ہندوؤں کے علاقوں پر قبضہ ہوا۔ اب موقعہ تھا۔ کہ یہ ہندوؤں کی اس کمینہ روش کا انتقام یہاں کی عورتوں کی بے حرمتی سے لیتے۔ لیکن انہوں نے کیا کیا۔ اس کے متعلق مجھ سے نہیں، خود ہندوؤں کے ذمہ وار لیڈروں کی زبان سے سنیئے۔ ہندوستان کی لوک سبھا (پارلیمان) میں، وہاں کے ایک ممبر (مسٹر کپور سنگھ) نے کہا۔ کہ فاضلکا سیکٹر میں مسلمان سپاہیوں نے ہندوستانی عورتوں کو اغوا کیا۔ اس پر وہاں کے وزیر دفاع مسٹر چون نے کہا۔ کہ میرے علم میں ابھی تک کوئی ایسا واقعہ نہیں آیا۔ تاہم میں اس کی تحقیق کروں گا۔ اور اس تحقیق کے سلسلہ میں مشرقی پنجاب کے وزیر اعظم مسٹر رام کشن نے اعلان کیا۔ کہ

پاکستانی سپاہیوں نے کسی ایک عورت کو بھی اغوا نہیں کیا۔

انتقام لینے کی قوت رکھتے ہوئے، ضابطہ اخلاق کی اس طرح پابندی کرنا، بڑی ہمت کا کام ہے اور اس بلندیٔ کردار اور ضبط نفس کا مظاہرہ، ان فوجی نوجوانوں کی طرف سے ہوا جنہیں ہمارا "مذہب پرست" طبقہ "ٹیڈی بائیز"۔ "ٹیڈی بائیز" کہہ کہہ کر، بدنام کیا کرتا تھا۔

خطرہ کا مقام

بہر حال میں کہہ یہ رہا تھا۔ کہ قائداعظم نے اپنے بستر مرگ سے پاکستان کی مدافعت کے لئے جو تلقین کی تھی، ہماری افواج نے اسے میدانِ جنگ میں پورا کر کے دکھا دیا، لیکن اس کے بعد اب ہم پھر اس مقام پر آگئے ہیں جس مقام پر اگست ۱۹۴۷ء میں تھے۔ یعنی جب ہماری جنگ میدان کارزار سے ہٹ کر بساط سیاست کی طرف منتقل ہوگئی تھی، اور جہاں ہم ثالثی کو مان کر اتنا بڑا فریب کھا گئے تھے۔ ہمیں امید ہے کہ اب ہم اس "تجربہ" سے فائدہ اٹھائیں گے۔ اور دوبارہ اس قسم کا دھوکا نہیں کھائیں گے۔ کہ

"مومن ایک سوراخ سے دو مرتبہ نہیں ڈسا جاتا"

کامیابی کا راز

اس قسم کے مہیب خطرات میں، کامیابی کا راز کیا ہے۔ اس کے متعلق قائداعظمؒ ہی کی زبان سے سنیئے۔ انہوں نے پاکستان کی جنگ لڑتے ہوئے کہا تھا۔

اس وقت میدان سیاست میں ہندو مسلمانوں کی جنگ ہو رہی ہے۔ لوگ

پوچھتے ہیں۔ کہ کون فتحیاب ہوگا۔ علم غیب تو خدا کو ہے۔ لیکن میں ایک مسلمان کی حیثیت سے علی رؤس الاشہاد کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہم قرآن مجید کو اپنا آخری اور قطعی رہبر بنا کر ثبات و استقامت پر کاربند رہیں اور اس ارشادِ خداوندی کو کبھی فراموش نہ کریں۔ کہ مسلمان سب بھائی بھائی ہیں۔ تو ہمیں دنیا کی کوئی طاقت یا کئی طاقتوں کا مجموعہ بھی مغلوب نہیں کر سکتا۔

یعنی "قرآن مجید کو اپنا آخری اور قطعی رہبر بنا کر ثبات و استقامت پر کاربند رہنا اور اس ارشادِ خداوندی کو سامنے رکھنا کہ مسلمان سب بھائی بھائی ہیں" ـــــ اس سے وہ قوت حاصل ہوتی ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں کر سکتی۔ خدا کرے کہ ہمیں یہ قوت حاصل ہو جائے! ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم ـــــ والسلام

شکوک شبہات اعتراضات

سلیم کے نام خطوط

پیدا ہوتے ہیں کس کے دل میں؟ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں
ان کا جواب آپ کے پاس کیا ہوتا ہے؟ ماتھے پر شکن۔ گھرکی۔ لاحول
کیا اس سے یہ شکوک رفع ہو جاتے ہیں؟ اگر آپ ایسا سمجھتے ہیں تو آپ
فریبِ نفس میں مبتلا ہیں۔ یہ شکوک رفع ہونگے دلائل و براہین سے تعلیم اور
بصیرت سے۔ بشرطیکہ سمجھانے کا طریقہ بھی دل نشین اور جاذبِ توجہ ہو
اگر آپ فی الواقعہ کسی نوجوان کے دل سے شکوک و شبہات
کی پھانسیں نکالنا چاہتے ہیں۔ تو ـــ انہیں

دیجئے۔ اور پھر دیکھئے کہ اس میں کیا انقلاب پیدا ہوتا ہے۔

جلد اول آٹھ روپے — جلد دوم چھ روپے — جلد سوم چھ روپے

ملنے کا پتہ:۔ ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ لاہور

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں

ستمبر ۱۹۶۵ء کی آویزش میں، ہماری فضائیہ کے شاہین بچوں نے جن محیر العقول کارناموں کا مظاہرہ کیا تھا۔ ان کی تفاصیل ہماری نگاہوں سے گزر چکی ہیں لیکن ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ کی دسمبر ۱۹۶۵ء کی اشاعت میں عنایت اللہ صاحب کے قلم سے جو فضائیہ کی روئیداد شائع ہوئی ہے۔ اس میں بعض ایسے نادر واقعات کا ذکر آیا ہے۔ جو اس سے پہلے ہماری نظروں سے کہیں نہیں گزرے۔ انہیں سیارہ ڈائجسٹ کے شکریہ کیساتھ درج ذیل کیا جاتا ہے۔ عنایت اللہ صاحب قارئین طلوع اسلام کے جانے پہچانے ہیں ان کے بعض مقالات بھی طلوع اسلام میں شائع ہو چکے ہیں اور ان کی تصنیف "دھتکارے ہوئے انسان" ان سے خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔

آغازِ سفر

عام طور پر ذہنوں میں یہ ہے کہ تقسیم ہند کے بعد جب بٹوارہ ہوا ہے۔ تو ہمارے حصے کا پورا سامان اور اسلحہ ہمیں مل گیا تھا۔ اور اسی سے ہم نے اس نوزائیدہ مملکت کی ابتدا کی تھی۔ لیکن درست نہیں۔ اس وقت تمام سامان ہندوستان میں تھا۔ اور ہندو کی ذہنیت کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے سنیئے۔ کہ جہاں تک فضائیہ کا تعلق ہے ہمارے حصے میں کیا آیا تھا اور وہ ہمیں کس طرح دیا گیا تھا ــــ عنایت صاحب لکھتے ہیں۔

بھارت کی پاکستان دشمنی کے مظاہرے تو روزِ اوّل سے ہی شروع ہو گئے تھے۔ جس کی بدترین، اور شرمناک مثالیں پاک فضائیہ کے ابتدائی اور کٹھن باب میں ہمیشہ یاد کی جایا کریں گی۔ ایک تو ہمارے حصے میں ٹمپسٹ (TEMPEST) قسم کے دقیانوسی طیاروں کی انتہائی قلیل تعداد آئی تھی اور ان کی ٹیکنیکی دیکھ

بحال کے لئے زمینی سٹاف بالکل ہی ناکافی تھا۔ ہندو اور سکھ ہوا باز ابھی بھارت واپس جا رہے تھے اور خبریں مل رہی تھیں کہ وہ سٹوروں سے بھی اور طیاروں میں سے بھی اہم اور نایاب کل پرزے (سپیئر پارٹس) نکال کر ساتھ لئے جا رہے ہیں چنانچہ چند ایک مسلمان ہوا بازوں نے اپنے طیاروں کی چوکیداری شروع کر دی۔

پاکستان کے ہوائی اڈے سوائے پشاور کے سب غیر آباد ہو گئے تھے۔ کہیں کہیں کوئی اِکّا دُکّا طیارہ پڑا تھا گو وہ بیکار تھے لیکن ان کے انجن کام آ سکتے تھے۔ ہندو ہوا باز جاتے جاتے ان طیاروں میں برقی ڈرلوں سے سوراخ کر کے بیکار بنا گئے۔ صرف طیاروں کو ہی نہیں انہوں نے بعض اڈوں پر فلائنگ کنٹرول کے وائرلیس سسٹم کو بھی بیکار کر دیا تھا۔ ان قیمتی چیزوں اور جگہوں کی چوکیداری کون کرتا؟ مسلمان ہوا باز جنہیں پاکستان ایئر فورس میں آنا تھا بھارت کے مختلف ہوائی اڈوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ ان کے زندہ و سلامت پاکستان پہنچ جانے کے امکانات بھی کم ہی تھے۔

پاکستان کے پاس نہ کوئی تربیتی طیارہ تھا، نہ کوئی انسٹرکٹر، نہ فلائنگ ٹریننگ سکول، نہ ٹیکنیکل ٹریننگ سنٹر۔ پرواز کی تربیت کے دو سنٹر (ابتدائی جودھپور، اور اعلیٰ انبالہ) بھارت میں تھے۔ وہاں جدید قسم کے تمام لوازمات موجود تھے۔ جو دورِ حاضر کے ہوا باز کی تربیت کے لئے ضروری ہوتے ہیں۔ تجربہ کار انسٹرکٹر بھی وہیں رہ گئے تھے۔ کیونکہ وہ مسلمان نہیں تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ بھارت کو بنی بنائی، تیار بر تیار ہوائی فوج مل گئی تھی اور اس کے روزمرہ کے معمولات میں ذرہ بھر فرق نہ آیا تھا۔ پاکستان کی فضائی طاقت نہ ہونے کے برابر تھی۔ بھارت نے ہمارا ساز و سامان روک لیا تھا۔ ایک دن ہمیں یہ خوشخبری ملی کہ بھارت سے وہ راکٹ اور ایمونیشن آ رہے ہیں جو ہمارے حصے میں آئے ہیں۔ جب یہ ساز و سامان پہنچا، تو کئی پیٹیوں، اور بکسوں میں سے پتھر نکلے۔ پھر ایک اور خوشخبری سنائی گئی کہ ہمارے حصے میں آٹھ ٹائیگر ماتھ طیارے آئے ہیں۔ ٹائیگر ماتھ دو پروں کا وہ طیارہ ہے جو پہلی عالمی جنگ سے ذرا پہلے ایجاد ہوا تھا۔ اس کی پرواز ہواؤں اور موسموں کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ مخالف سمت سے ہوا کا ایک تیز جھونکا آ جائے، تو ٹائیگر ماتھ ہوا میں معلق رہ جاتا ہے۔ اس وقت کی برطانوی ہند کی فضائیہ میں یہ قدیم طیارے تربیت کے لئے استعمال کئے جاتے تھے۔ بھارت نے اطلاع دی تھی کہ اپنے ٹائیگر ماتھ جودھپور سے لے جاؤ جس کا مطلب یہ تھا کہ انہیں جودھپور میں ہی پڑا رہنے دو۔ اتنی دور اڑا کے کیسے لیجاؤ گے؟

ٹائیگر ماتھ کی رفتار خوشگوار اور پرسکون موسم میں ساٹھ ستر میل فی گھنٹہ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اور اگر موسم کے تیور بدل جائیں تو اسے اتار لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ اس کی ایک اڑان بمشکل سو میل تک ہوتی ہے۔ ان آٹھ ٹائیگر ماتھوں کو جودھپور سے سینکڑوں میل دور رسالپور لانا تھا۔ ہمارے پاس اتنے ہوا باز

بھی نہیں سمجھے۔ جو انہیں جھکے اڑا لائے۔ بھارت نے ہمارے ساتھ عملی مذاق کیا تھا۔

پاکستان فضائیہ کا ایک ڈکوٹہ طیارہ (مسافر بردار) دو پاکستانی فلائنگ افسروں اور زمینی عملہ کے دو ارکان کو لے کے جودھ پور پہنچا۔ وہاں کے ٹریننگ سنٹر میں دو چار مسلمان کیڈٹ (زیر تربیت ہوا باز) تھے۔ انہوں نے ابھی دو دو گھنٹوں کی بھی پرواز نہیں کی تھی۔ ان کی حالت ان بچوں کی سی تھی۔ جنہوں نے ابھی بمشکل کھڑے ہونا سیکھا ہو۔ اور ان سے دوڑنے کی توقع رکھی جائے۔ کوئی چارہ نہ تھا۔ انہیں شاہیں بچوں کو ٹائیگر ماتھوں کی سینکڑوں میل کی مسلسل پرواز کا انتہائی نازک اور پرخطر فرض سونپ دیا گیا۔ دو طیاروں کو دونوں فلائنگ افسروں نے سنبھال لیا۔ اور چھ میں ایک ایک کیڈٹ بیٹھ گیا۔ ڈکوٹے میں پٹرول کے چند کنستر رکھ لئے گئے۔

اگر بھارت والے ان طیاروں کو جگہ جگہ پٹرول مہیا کرنے کا بندوبست کر دیتے۔ تو بھی کوئی مشکل نہیں تھی لیکن عداوت کی ایسی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ کہ ہمارے ہوا بازوں کو ہندو قہر آلود اور حقارت آمیز نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ اور انہیں کوئی پانی کا ایک گھونٹ پلانے پر بھی آمادہ نظر نہ آتا تھا۔ ان تمام مشکلات کے باوجود یہ قافلہ فضا کے انتہائی پرخطر سفر پر روانہ ہو گیا۔ آٹھ ٹائیگر ماتھوں کے اوپر ایک ڈکوٹہ اڑ رہا تھا۔ جس کی رفتار ان طیاروں سے تین چار گنا زیادہ تھی۔ ڈکوٹہ ان کے اوپر چکر کاٹ کاٹ کر ان کا ساتھ دے رہا تھا۔

نیچے بھارتی ہوا باز یقیناً ہنس رہے ہونگے۔ اور اس خبر کا بیتابی سے انتظار کر رہے ہوں گے کہ آٹھوں ٹائیگر ماتھ راستے میں تباہ ہو گئے ہیں۔ اگر وہ ہنستے تھے۔ تو حق بجانب تھے۔ کیونکہ راستے میں ان کی خباثت کا انکشاف ہوا۔ انہوں نے ہمارے ٹائیگر ماتھوں کی تباہی کا سامان کر رکھا تھا۔ چنانچہ اوپر فضا میں ایک ٹائیگر ماتھ کا انجن بند ہو گیا۔ غیر تربیت یافتہ کیڈٹ طیارے کو بند انجن سے ہی گلائیڈ کر کے اتار لیا۔ خوش قسمتی سے نیچے ہموار علاقہ تھا۔ جنگل یا پہاڑ نہیں تھے۔ ڈکوٹے جیسے بڑے طیارے کے اترنے کے لئے قدرے بہتر زمین کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ہوا بازوں نے خطرہ مول لے کر ڈکوٹہ بھی اتار لیا جب ٹائیگر ماتھ میں پٹرول ڈالنے لگے تو دیکھا کہ پٹرول کی ٹینکی میں چینی پڑی ہوئی ہے۔ چینی ایک ایسی چیز ہے جو پٹرول میں حل نہیں ہوتی اور نالیوں کو بند کر دیتی ہے۔ بڑی مشکل سے ٹینکی صاف کی گئی اور اس میں ایک کنستر پٹرول انڈیلا گیا۔ اور طیارہ فضا میں بلند ہو گیا۔

ذرا آگے جا کر ایک اور ٹائیگر ماتھ کا انجن بند ہو گیا۔ اسے بھی بند انجن سے ہی محفوظ اتار لیا گیا۔ اس کی ٹینکی میں ریت پڑی ملی۔ کوشش کے باوجود ساری ریت ٹینکی سے نکل نہ سکی اور نالیاں صاف نہ ہو سکیں اس طیارے کو بھارت کے علاقے میں پھینک دیا گیا اور اس کا کیڈٹ ہوا باز ڈکوٹے میں بیٹھ گیا۔

سات ٹائیگر ماتھ ایک ڈکوٹے کے نیچے یوں جھومتے، جھولتے، ڈگمگاتے اڑے جا رہے تھے۔ جیسے

ننھے بچوں کو گھر سے نکال کر جنگل کی طرف دھکیل دیا جائے۔ اور ان کی بے بس اور دکھیاری ماں بے بسی میں ساتھ ساتھ چلی جا رہی ہو۔

راجپوتانہ کے اوپر کا سفر بہت کٹھن اور خطرناک تھا۔ نیچے ریگزار تھا جہاں طیارہ اتر تو سکتا تھا۔ لیکن وہاں سے اٹھ نہ سکتا تھا کیونکہ پہیے ریت میں پھنس کر رفتار نہیں پکڑ سکتے تھے۔ وہاں بھی ٹائیگر ماتھوں کا باری باری پٹرول ختم ہوا۔ اور وہ نیچے اترے۔ ڈکوٹہ کو اچھی زمین کی تلاش میں ان سے بہت دور اترنا پڑا۔ اور ہوا باز کنستر اٹھا کر پیدل ٹائیگر ماتھوں تک گئے۔ پٹرول ڈالا اور انہیں بڑے بڑے جتنوں سے ریگستان سے اٹھایا۔ یہ مشکل ایک بار نہیں بلکہ کئی بار پیش آئی۔

مشرقی پنجاب کے اوپر سے اڑ کر آنا اور زیادہ خطرناک تھا۔ کیونکہ نیچے ہندو سکھ مسلمانوں کے قتل عام میں مصروف تھے۔ وہاں طیاروں کو پٹرول کے لئے اتارنا خودکشی کرنے والی بات تھی۔ طیارے سندھ کے اوپر سے میانوالی کی طرف سے رسالپور پہنچائے گئے۔ لیکن دو ٹائیگر ماتھ راستے میں ہی پھینکنے پڑے۔ بھارت کی چینی اور ریت کام کر گئی تھی۔

ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات

اس سے ہم نے اپنے فضائیہ کی ابتدا کی۔ یہ ۱۹۴۷ء کا ذکر ہے۔ اور ۱۹۴۸ء میں ہمارے ان شاہین بچوں کی پہلی آزمائش کا وقت آگیا۔ اس میں انہوں نے اپنے بال و پر کا مظاہرہ کس ہنج سے کیا۔ اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے۔

پاکستانی فضائیہ کے ہوابازوں نے اب ہی نہیں ابتدا میں ہی اپنے جوہر دکھانے شروع کر دیئے تھے مثلاً ۱۹۴۸ء میں جنگ کشمیر کے دوران بھارت نے اپنی پوری کی پوری فضائی قوت استعمال کی تھی لیکن پاکستان نے مجاہدین کی مدد کے لئے اپنا ہوائی بیڑہ وقف کر رکھا تھا۔ اسی دوران ہمارا ایک ہوباز ڈکوٹہ طیارے میں کچھ دوائیاں اور اسی طرح کا انسانی بھلائی کا سامان کشمیری مجاہدین کے لئے پیراشوٹوں سے پھینکنے کشمیر کی فضا میں گیا۔ تو بھارت کے دو لڑاکا طیاروں نے اُسے فضا میں گھیر لیا۔ اور اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ ڈکوٹہ مسافر اور بار بردار طیارہ ہے اور بالکل نہتہ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہلکی سی مشین گن بھی نہیں ہوتی۔ جس سے ہوا باز اپنے دفاع میں لڑ سکیں۔ دشمن کے طیاروں کے نرغے میں آکر اپنے آپ کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ لیکن ہمارے ہواباز نے بھارت کے ہوابازوں کو وائرلیس پر للکار کر کہا۔ "میں تمہارے ہاتھ نہیں آؤں گا۔" اور وہ غوطے میں چلا گیا۔ لڑاکا طیاروں نے ڈکوٹے پر حملہ کر دیا اور دونوں نے

نہتے ڈکوٹے پر بے طرح گولیاں برسائیں۔ سکواڈرن لیڈر اور اس کے معاون ہوا باز نے فضا میں سینترے بدل بدل کر، ڈکوٹے کو نیچے وادی میں درختوں کی بلندی تک اڑا اڑا، اور اٹھا اٹھا کر دشمن کے ہر وار کو بیکار کیا۔ لڑاکا طیاروں نے ہمارے ڈکوٹے پر مکمل پینتیس (۳۵) منٹ تک جھپٹے مارے۔ لیکن ہر جھپٹا ناکام رہا۔ آخر ان کی ایک بوچھاڑ کی چند گولیاں ڈکوٹے میں ایسی لگیں کہ اندر بیٹھے ہوئے سپلائی کور کے ایک جمعدار کو شہید کر گئیں۔ ڈکوٹہ واپس آ گیا۔ اسے جو نقصان پہنچا تھا۔ وہ گراؤنڈ سٹاف نے چند گھنٹوں میں مرمت کر لیا۔ اور اگلے روز ڈکوٹہ پھر اڑنے لگا۔

مومنے بالائے ہر بالاترے

چند ہی سالوں کی تربیت کے بعد یہ آسمان پرواز کیا سے کیا بن گئے۔ یہ داستان بھی سننے کے قابل ہے۔

"آٹھ دس برس پیشتر انگلستان میں دولتِ مشترکہ کے تمام ممالک کے ہوا بازوں کا راکٹ اور گن فائرنگ کا فضائی مقابلہ ہوا تھا جس میں گزشتہ عالمی جنگ کے تجربہ کار ہوا باز، ان کے ہاتھوں تربیت یافتہ ہوا باز اور کینیڈا کے مشہور ہوا باز بھی شامل ہوئے تھے۔ اور یہ حقیقت آج بھی دولتِ مشترکہ کے ریکارڈ میں موجود ہے (اور ہمیشہ محفوظ رہے گی) کہ پاکستانی ہوا باز ہی مقابلے میں اول آئے تھے۔

جب پاک فضائیہ کو امریکی سیبر جیٹ ملے تو ان کی پرواز کی تربیت کے لئے ہمارے چند ہوا بازوں کو امریکہ بھیجا گیا۔ لیکن امریکہ کے فضائی انسٹرکٹروں نے جب پاکستانی ہوا بازوں کی ہنرمندی دیکھی تو وہ بے ساختہ کہہ اٹھے۔ کہ پاکستانی ہوا بازوں کو یہاں بلا کر تربیت دینے کی ضرورت نہیں انہیں صرف طیارے دے دو۔ ہمارے "زیر تربیت" ہوا بازوں نے وہاں بھی راکٹ اور گن فائرنگ میں انسٹرکٹروں کے منہ پھیر دیئے تھے۔

۱۹۵۸ء کے آخر میں پاکستانی فضائیہ کے ہوا بازوں نے فضائی کرتب کا ایک ایسا کمال دکھایا۔ جسے دنیا کے کسی بھی فضائیہ کے ہوا باز دہرا نہیں سکے۔ کسی نے اس سے پہلے ایسی جرأت ہی نہیں کی تھی۔ یہ کرتب تھا "ڈائمنڈ فارمیشن لوپ" یعنی سولہ جیٹ طیارے چوکور ہیرے کی شکل میں اڑا کر نہیں اسی شکل میں الٹا کر کے پھر سیدھا کرنا۔ کمال یہ تھا کہ بجائے اس کے کہ ہر طیارہ الگ الگ الٹا ہو کر سیدھا ہوا۔ پوری کی پوری فارمیشن اپنی ترتیب بدلے بغیر الٹی ہو کر آہستہ آہستہ سیدھی ہوئی اور آگے نکل گئی۔

انگلستان کے طیارہ سازوں کے دو مشہور جریدوں "فلائٹ" اور "ایروپلین" کے نامہ نگار جو خود منجھے ہوئے ہوا باز ہیں۔ وہاں موجود تھے۔ یہ کرتب دیکھ کر ان کی آنکھیں اور منہ حیرت سے کھل گئے تھے اور انہوں نے کہا تھا۔ کہ یہ فضائی کرتب انگلستان میں دکھایا جا چکا ہے لیکن سولہ طیاروں سے نہیں صرف چار طیاروں سے

روسی اور امریکی نمائندوں نے بھی ایسے ہی بے ساختہ تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا۔ کہ ہمارے ہوا باز اتنی جرأت نہیں کر سکتے۔

عنایت صاحب نے بتایا ہے کہ اس "ڈائمنڈ لوپ" کے فضائی قائد گروپ کیپٹن ظفر مسعود تھے۔ جنہوں نے سرگودھا کے معرکہ میں فضائی جنگ کی قیادت اس قابل فخر انداز سے کی ہے۔

پلٹنا، جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا

سکواڈرن لیڈر عالم سے اب کون سا پاکستانی واقف نہیں۔ وہ ہر برنا و پیر و جوان کی آنکھوں کا تارا ہیں۔ سنیئے کہ انہوں نے تیس سکنڈ میں پانچ طیارے کس طرح مار گرائے تھے۔ واضح ہے کہ ان کا یہ کارنامہ عالمی ریکارڈ کی حیثیت رکھتا ہے)

سکواڈرن لیڈر عالم نے جو داؤ کھیل کر تیس سیکنڈ میں پانچ طیارے مار گرائے تھے۔ وہ کھیل نہیں۔ اکثر ہوا باز یہی داؤ کھیلنا چاہتے ہیں۔ لیکن ہر کوئی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس میں پٹ جانے کا خطرہ زیادہ ہوتا ہے عالم نے چھ بھارتی طیاروں کو اپنے پیچھے لگا لیا تھا جب اس نے دیکھا کہ چھ کے چھ طیارے اسے نشانے میں لے چکے اور گنیں چلانے کو ہیں۔ تو اس نے پلک جھپکتے ایسی قلابازی لگائی کہ تمام دشمن طیارے اس کے اوپر سے آگے گزر گئے۔ عالم نے سیدھے ہو کر چند لمحوں میں سب کو اپنی مشین گنوں کی زد میں لے کر پانچ کو مار گرایا۔ اسے "لیڈ" دینا کہتے ہیں۔

صلۂ شہید کیا ہے؟

اور فلائٹ لیفٹیننٹ یونس! ــــ زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا ــــ سنیئے کہ اس نے دشمن کی قید کی حیات بے شرف پر مرگِ باشرف کو ترجیح دے کر قوم کا سر کتنا اونچا کر دیا۔

پٹھانکوٹ پر حملے کے دوران ہمارے فلائٹ لیفٹیننٹ یونس شہید دشمن کی گولیوں سے مجروح ہو گئے اور ان کے طیارے کو بھی نقصان پہنچا۔ آپ پیراشوٹ کے ذریعے طیارے سے نکل سکتے تھے۔ آپنے اپنے فلائٹ کمانڈر سے کہا ــــ

"شاید میں اپنے علاقے تک نہ پہنچ سکوں۔ یہاں اتر کر میں ہندوؤں کے ہاتھوں قید نہیں ہونا چاہتا۔ مجھے اجازت دیجئے کہ جس مقصد کے لئے یہاں آیا ہوں۔ وہ پورا کر سکوں" اتنا کہنے کے بعد فلائٹ کمانڈر کے ساتھ آپکے وائرلیس کا رابطہ ٹوٹ گیا۔ فلائٹ کمانڈر نے دیکھا کہ یونس شہید اپنے طیارے کو غوطے میں

ڈال چکے تھے۔ اور طیارہ پٹھان کوٹ کے ہوائی اڈے کے ایک ہنگر (جہاں طیارے رکھے ہوتے ہیں) کی سیدھ میں جا رہا تھا۔ یونس شہید کے ساتھی ہوابازوں نے اوپر سے دیکھا۔ کہ آپکے طیارہ نیچے کھڑے بھارتی مگ طیاروں سے ٹکرایا۔ اور کئی طیاروں کو اپنے ونگ سے چھری کی طرح کاٹتے ہوئے سامنے والے ہینگر کے اندر کریش کیا۔ پاکستانی ہوابازوں کا مشن کامیاب رہا۔ پٹھان کوٹ کا ہوائی اڈہ خاموش ہوگیا۔ یونس تو شہید ہوگیا۔ لیکن ملتِ پاکستانیہ کا سر بلند ہوگیا۔

اور دیکھیئے ـــــ

بھارت میں اگلے مورچوں کے لئے گولہ بارود سے بھری ہوئی ایک لمبی مال گاڑی امرتسر کی طرف چلی آ رہی تھی ـــــ ہمارے صرف دو ہوابازوں نے اس گاڑی کو بھارتی مورچوں سے دو میل پیچھے اس طرح تباہ کر دیا۔ کہ بارود نہ رہا۔ اسلحہ نہ رہا۔ مال گاڑی نہ رہی، مال گاڑی کے نیچے ریلوے لائن نہ رہی۔ اس کامیاب حملے میں (جس سے بھارت کی کمر ٹوٹ گئی تھی) ہمارا ایک ہواباز راکٹ ٹھکانے پہ مارنے کے لئے اس قدر نیچے چلا گیا تھا۔ کہ اپنے ہی راکٹوں، اور گاڑی میں پھٹتے گولہ بارود کی زد میں آکر شہید ہوگیا۔ لیکن جس مقصد کے لئے وہ اپنی جان پر کھیل گیا تھا۔ وہ پورا ہوگیا۔

بنیاد کی اینٹیں

فضائی جنگ میں، فضا میں اڑنے والے جانبازوں کے معرکے دیکھنے میں بھی آئے اور سننے میں بھی لیکن فضائیہ کا ایک شعبہ ایسا ہے۔ جو درحقیقت بنیاد کی اینٹوں کی حیثیت رکھتا ہے لیکن بنیاد کی اینٹوں کی طرح وہ نگاہوں سے پوشیدہ بھی رہتے ہیں۔ حالانکہ عمارت کا سارا بوجھ انہیں کے سر پر ہوتا ہے۔ اسے گراؤنڈ سٹاف کہتے ہیں۔ جن کا کام یہ ہے کہ وہ ہر طیارہ کو ہر وقت اڑنے کے قابل رکھیں۔ جنگ میں جب ایک طیارہ حملے سے واپس آتا ہے تو اسے دوبارہ پرواز کے قابل قرار دینے کے لئے اس کے ایک ایک رگ و ریشہ کا نہایت دقتِ نظر سے معائنہ کرنا، اور مرمت طلب عناصر کی مرمت کرنا ان کے ذمے ہوتا ہے۔ آپ سوچئے۔ کہ یہ کام کس قدر ذمہ دارانہ ہوتا ہے۔ اور اس میں "وقت کا عنصر" کس قدر اہمیت رکھتا ہے۔ اگر ایک طیارہ میں کہیں ذرا سا بھی نقص رہ جائے۔ تو معلوم اس کا نتیجہ کس قدر تباہ کن ہو۔ اور اگر طیاروں کے نقائص رفع کرنے میں دیر لگ جائے۔ تو اسی نسبت سے حملوں کی تعداد میں کمی ہو جائے۔ بالخصوص جب ہمارے طیاروں کی تعداد دشمن کے مقابلہ میں پانچواں حصہ بھی نہیں تھی۔ سنیئے کہ ہمارے فضائیہ کے گراؤنڈ سٹاف نے کس عقابی نگاہ اور برقی رفتار سے شب و روز کام کیا۔

ہمارے گراؤنڈ سٹاف (ایئرمین) کو غیر ملکی نامہ نگاروں نے خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ

پاک فضائیہ کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے۔ کہ زمین پر کام کرنے والے ہوابازوں نے چھیاسی (۸۶) فی صد طیاروں کو ہر لحہ تیار رکھا ہے۔ چھیاسی فیصد کا مطلب دراصل سو فیصد ہوتا ہے۔ عام حالات میں طیاروں کی تیاری پچاس فیصد تک ہو تو اسے گراؤنڈ سٹاف کا کمال سمجھا جاتا ہے لیکن جنگی حالات میں جب بعض طیارے ونگوں اور دیگر حصوں میں دشمن کی گولیوں کے سوراخ لے کے آئیں تو انہیں چند منٹوں میں اڑنے کے قابل بنا دینا ایک کمال ہے جو صرف پاک فضائیہ کے ائیر مینوں نے کر دکھایا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ دوسری عالمی جنگ میں جب میں برطانوی ہند کی ائیر فورس میں تھا۔ تو جو طیارے گولیوں سے مجروح ہو کے آتے تھے، یا جن کا وائرلیس سسٹم بگڑ جاتا تھا۔ یا جن میں کوئی اور خرابی پیدا ہو جاتی تھی۔ تو ہم دیسی لوگ ہی نہیں خود برطانوی ائیر مین بھی ایسے طیاروں کی مرمت کرتے کئی کئی روز صرف کر دیا کرتے تھے۔

حملے کے بعد طیارے میں ازسرِ نو راکٹ لگانے پڑتے ہیں، مشین گنوں میں گولیوں کے نئے پٹے ڈالنے پڑتے ہیں۔ بعض مشین گنیں فائر کرتے رکتی ہیں۔ انہیں ہواباز کی رپورٹ کے مطابق ٹھیک کرنا ہوتا ہے۔ پٹرول ٹینکوں کو ازسرِ نو بھرا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی سسٹم کا ازسرِ نو معائنہ کرنا ہوتا ہے۔ ان تمام کاموں میں خاصا وقت صرف ہوتا ہے۔ لیکن پاک فضائیہ کے گراؤنڈ سٹاف یہ کام منٹوں میں کر کے طیاروں کو پھر سے فضا میں بھیج دیتے رہے۔ زمین پر کام کرنے والوں کو جس قدر خراجِ تحسین پیش کیا جائے کم ہے۔

ٹھیک کہا ہے کہ انہیں جس قدر خراجِ تحسین بھی ادا کیا جائے کم ہے۔

پاکستانی فضائیہ کے شاہین بچو! قوم کو تم پر ناز ہے۔ اللہ تمہیں ہر وقت اور ہر مقام پر اپنی حفاظت میں رکھے۔ اور زندگی کے ہر بلند مقصد میں کامیابی و کامرانی عطا کرے۔

گرچہ اس دیرِ کہن کا ہے یہ دستورِ حیات!
کہ نہیں میکدہ و ساقی و مینا کو ثبات!
قسمتِ بادہ مگر حق ہے اسی ملت کا!
انگبیں جس کے جوانوں کو ہے تلخابِ حیات!

مُفت مجرّب دوا۔ برائے۔ دمہ۔ درد گردہ پتھری
ملنے کا پتہ: حاجی محمد دین شیخ آئس فیکٹری۔ متصل گنش کھوپڑہ ملز
لارنس روڈ۔ کراچی
نوٹ:۔ جوابی لفافہ ضرور آنا چاہیئے۔

سائنس اور ایمان

قرآنک اسٹڈی سرکل میں ایک سوال کا جواب

"سائنس ثبوت فراہم کرتی ہے لیکن ایمان نہیں۔
مذہب ایمان فراہم کرتا ہے لیکن ثبوت نہیں"

ان الفاظ کو عام طور پر اس طرح دہرا دیا جاتا ہے گویا یہ ایک ایسا مسلّمہ ہے جس پر نہ کسی غور و فکر کی ضرورت ہے نہ یہ قابلِ تردید ہے۔ حالانکہ اس مفروضہ کے دونوں اجزاء غلط ہیں۔ قبل اس کے کہ ہم اس غلطی کو سامنے لائیں، یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ایسا کہنے والوں کے نزدیک:

(۱) سائنس سے مراد ہوتے ہیں وہ علوم جن کا تعلق محسوسات سے ہے۔ یعنی طبیعیات (Physics) جس کا تعلق مادہ (Matter) سے ہے۔ حیاتیات (Biology) جس کا تعلق زندگی (Life) سے ہے۔ اور نفسیات (Psychology) جس کا تعلق نفسِ انسانی (Mind) کے احوال و ظروف سے ہے۔

(۲) ایمان سے مراد ہوتا ہے کسی بات کو بلا دلیل اور ثبوت تسلیم کر لینا۔ اور

(۳) مذہب میں اسلام بھی شامل ہوتا ہے۔ حالانکہ اسلام، مذہب نہیں، دین ہے۔ لہٰذا جب ہم اسلام کے متعلق گفتگو کریں گے تو اس سے ہماری مراد دین ہوگا جو قرآن کریم کے اندر ہے۔

(۲) اب لیجئے اس مغالطہ کو جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ "سائنس ثبوت فراہم کرتی ہے، ایمان نہیں" سے ان کی مراد یہ ہوتی ہے کہ ایک سائنٹسٹ کسی ایسے نظریہ، اصول یا قانون کو نہیں مانتا جس تک وہ تجربہ کی بنا پر نہ پہنچا ہو۔ یہ غلط ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ سائنٹسٹ تجربات اور مشاہدات کے بعد نتائج تک پہنچتا ہے۔ لیکن جن بنیادی اصولوں پر اس کے تجربات کی عمارت استوار ہوتی ہے، ان تک وہ تجربہ کی بنا پر نہیں

پہنچا ہوتا۔ اصل کے اعتبار سے سائنس کے قوانین کی دو قسمیں ہیں۔

(i) اساسی یا بنیادی قوانین جنہیں (Axioms) کہا جاتا ہے۔ یہ قوانین اپنی دلیل آپ ہوتے ہیں۔ یعنی (Self-evident)۔ انہیں (Assumed Truths) بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی ایسی صداقتیں جنہیں ہم صداقتیں تسلیم کر کے آگے بڑھ سکتے ہیں۔

(ii) ابتدائی قوانین (Primary Laws) بنیادی قوانین کو صداقت تسلیم کر کے، سائنٹسٹ تجربات یا مشاہدات کی رو سے جن نتائج تک پہنچتا ہے، انہیں "پرائمری لاز" کہا جاتا ہے۔ (قوانین کی ایک تیسری قسم ــــ ثانوی قوانین ــ بھی ہوتی ہے۔ لیکن وہ ہماری موجودہ بحث کے دائرہ سے خارج ہیں)۔

سوال یہ ہے کہ جن قوانین کو بنیادی صداقتیں تسلیم کیا جاتا ہے ان تک سائنس کس طرح پہنچی ہے؟ اس کے متعلق تین نظریات ہیں۔

(i) نظریۂ وجدان۔ یعنی (Intuitional or a priori Theory) اس نظریہ کی رو سے تسلیم کیا جاتا ہے کہ یہ قوانین خود انسانی فطرت کے اندر داخل ہیں۔ ان تک انسان کسی تجربہ کے بعد نہیں پہنچا۔

(ii) تجرباتی نظریہ (Empirical or Posteriori Theory) اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان قوانین تک تجربات کی رو سے پہنچے ہیں۔

(iii) ارتقائی نظریہ (Evolutionary Theory) کی رو سے کہا جاتا ہے کہ ہمارے قدیم اسلاف ان قوانین تک تجربات کی رو سے پہنچے تھے لیکن اب یہ قوانین ہماری فطرت کے اندر داخل ہیں اس لئے ہم انہیں بلا دلیل و ثبوت تسلیم کر لیتے ہیں۔

نظریہ (i) : (iii) اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ــــ جبکہ مغرب میں مادی نظریۂ حیات عروج پر تھا، قابل تسلیم سمجھے جاتے تھے لیکن اب انہیں وقیع نہیں سمجھا جاتا۔ اب سائنسدان اس بحث ہی میں نہیں الجھتے کہ ان قوانین تک انسان کیسے پہنچا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ قوانین موجود ہیں اور ہم انہیں تسلیم کئے بغیر آگے بڑھ نہیں سکتے، ان کی صداقت کا اعتراف ہر سائنٹسٹ کے اندر موجود ہوتا ہے۔ یہ کسی تجربہ کی محتاج نہیں ہوتی۔ یہ قوانین کیوں ایسے ہیں؟ اس کے لئے نہ ہم کوئی وجہ بیان کر سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی دلیل دے سکتے ہیں۔ یہ موجود ہیں۔ اور ان کا وجود ان کا ثبوت ہے۔

یہ اساسی قوانین (Axioms) درج ہیں:

(i) قانون علت و معلول (Law of cause and effect) یعنی یہ قانون کہ ہر حادثہ کا کوئی نہ کوئی سبب ضرور ہوتا ہے، یا ہر عمل ایک خاص نتیجہ مرتب کرتا ہے۔ اور

(۳) قانون وحدتِ کائنات (Law of uniformity of Nature) اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات میں آپ کسی جگہ بھی کیوں نہ ہوں - جس عمل نے ایک خاص نتیجہ مرتب کیا تھا، وہ عمل جب انہی حالات میں پھر وجود میں آئے گا، تو اس کا نتیجہ ہر مقام پر اور ہمیشہ وہی ہوگا۔

یہ ہیں وہ دو اساسی اور بنیادی قوانین جن پر سائنس کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔ اور یہ دونوں، بلا دلیل تسلیم کئے جاتے ہیں - یعنی ان تک انسان اپنے تجربات کے بعد نہیں پہنچا - انہیں بطور بنیادی صداقت کے تسلیم کر کے اپنے تجربہ کی بنیاد بنایا جاتا ہے۔ اس کے ان تجربات کے نتائج، ان قوانین کی صداقت کا ثبوت بنتے چلے جاتے ہیں۔

قرآن کریم کا انداز بعینہٖ یہی ہے - وہ کچھ مسلمات پیش کرتا ہے اور کہتا ہے کہ انہیں بنیادی قوانین تسلیم کر کے ان کے مطابق عمل کرتے جاؤ - نتائج خود بخود ان مسلمات کا ثبوت بنتے جائیں گے - چنانچہ وہ اپنی دعوت کی بنیاد ہی اسی اصول پر استوار کرتا ہے - وہ، ان لوگوں سے جو مسلمات کو نہیں مانتے، کہتا ہے کہ اِعْمَلُوْا عَلٰی مَكَانَتِكُمْ اِنَّا عٰمِلُوْنَ - تم اپنے پروگرام کے مطابق کام کرو - ہم اپنے مسلمات کے مطابق کام کرتے ہیں - وَانْتَظِرُوْا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ (۱۱/۱۲۲) پھر تم بھی نتائج کا انتظار کرو - ہم بھی انتظار کرتے ہیں - فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ (۶/۱۳۵) - نتائج خود بخود بتا دیں گے کہ کس کے مسلمات صداقت پر مبنی ہیں۔

ان مسلمات کو بطور صداقت تسلیم کرنے کا نام "ایمان بالغیب" ہے - یعنی کسی دعوے کو اس کے نتائج دیکھنے سے پہلے (a priori) تسلیم کر لینا - اور اعمالِ صالح، اس پروگرام کا نام ہے جس کے نتائج اس دعوے کی صداقت کی دلیل اور ثبوت بنتے جائیں۔

یہ مسلمات معدودے چند، اور نہایت واضح ہیں - یعنی؛

(۱) ایک ایسی ہستی پر ایمان جس کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق یہ سلسلۂ کائنات اس حسن و خوبی سے چل رہا ہے اسے خدا کہتے ہیں۔

(۲) قانونِ مکافاتِ عمل ــــ یعنی ہر عمل ایک متعین نتیجہ پیدا کر کے رہتا ہے۔

(۳) قانونِ وحدتِ کائنات ــــ یعنی پوری کائنات میں صرف خدا کے قوانین کارفرما ہیں - اسی کو خدا کا اقتدار کہتے ہیں۔

پہلے مسئلہ کے متعلق وہ کہتا ہے کہ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ (۱۶/۴۹) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، سب اس کے قوانین کے سامنے جھکا ہوا ہے - اور ان

قوانین کی کیفیت یہ ہے کہ لَا تَبْدِیْلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰہِ (۱۰/۶۴) - قوانین خداوندی میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ (سائنس کی ساری عمارت اس حقیقت پر قائم ہے کہ ان قوانین میں تبدیلی نہیں ہوتی)۔

دوسرے مسلمہ کے متعلق قرآن کریم میں ہے۔ خَلَقَ اللّٰہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰی کُلُّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ (۴۵/۲۲)۔ خدا نے اس کارگہ کائنات کو حق پر مبنی پیدا کیا ہے۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ ہر ایک کو اس کے کام کا ٹھیک ٹھیک نتیجہ مل جائے۔ یعنی کائنات کی یہ عظیم القدر شیرازی اس لئے مصروف عمل ہے کہ ہر کام کا نتیجہ "قانون خداوندی کے مطابق برآمد ہوتا چلا جائے۔

اور تیسرے مسلمہ کے متعلق اس نے کہا کہ ھُوَ الَّذِیْ فِی السَّمَآءِ اِلٰہٌ وَّ فِی الْاَرْضِ اِلٰہٌ (۴۳/۸۴)۔ کائنات کی پستیوں میں بھی اُسی کے قوانین کی کارفرمائی (اقتدار) ہے۔ اور اس کی بلندیوں میں بھی انہی کی کارفرمائی (اقتدار)۔ لَوْ کَانَ فِیْھِمَآ اٰلِھَۃٌ اِلَّا اللّٰہُ لَفَسَدَتَا (۲۱/۲۲)۔ اگر کائنات میں کسی اور کے قوانین بھی کارفرما ہوتے تو یہ سارا سلسلہ تہس نہس ہو جاتا۔ وحدتِ قانون اور وحدتِ کائنات وہ بنیادی صداقتیں ہیں جن کی بنا پر یہ سلسلہ قائم ہے۔

ان مسلمات کی سند میں قرآن کریم کی صرف ایک ایک آیت پیش کی گئی ہے۔ ورنہ قرآن کریم کا بیشتر حصہ انہی کی تائید میں ہے۔

اب رہا اِن اساسی مسلمات کی روشنی میں، ابتدائی قوانین (PRIMARY LAWS) کا دریافت کرنا، جس کا طریق تجرباتی اور مشاہداتی ہے، سو قرآن کریم ان آیات سے بھرا پڑا ہے جن میں اس نے کارگہ فطرت کے ایک ایک گوشے پر غور و فکر کی نہ صرف دعوت دی ہے بلکہ تاکید کی ہے۔ اور اسے ان افراد کا ذریعہ قرار دیا ہے جو قرآن کے بیان کردہ اساسی مسلمات پر ایمان رکھتے ہیں۔ اِن آیات کے اس مقام پر درج کرنے کی ضرورت نہیں۔ (جو احباب انہیں بیک نظر دیکھنا چاہیں وہ میری تصنیف "اسلام کیا ہے" میں "عقل اور وحی" اور "انسان اور خارجی کائنات" کے عنوانات ملاحظہ فرما سکتے ہیں)۔

ان قوانین کے دریافت کرنے کا سائنٹفک طریق یہ ہوتا ہے کہ پہلے ایک مفروضہ Hypothesis سامنے رکھا جاتا ہے اور اس پر عمل کر کے دیکھا جاتا ہے کہ وہ صحیح نتیجہ تک پہنچاتا ہے، یا نہیں۔ اگر اس کا صحیح نتیجہ مرتب نہ ہو تو اسے چھوڑ کر کوئی دوسرا مفروضہ اختیار کیا جاتا ہے۔ اس طرح "تجارب و اغلاط (Trial and error) کے طول طویل طریق کے بعد کسی حتمی نتیجہ پر پہنچا جاتا ہے۔ ان مفروضات کے لئے بھی کچھ اصول اور قواعد مقرر ہیں۔ جس قدر کوئی مفروضہ ان اصولوں کے مطابق ہوگا، اتنا ہی اس کے صحیح ہونے کا امکان

ہوگا۔ اس کے لئے موٹے موٹے اصول حسب ذیل ہیں۔

(۱) مفروضہ کو کسی حقیقت (Fact) پر مبنی ہونا چاہئے۔ محض "شاعرانہ تخیل" نہیں ہونا چاہیئے۔
قرآن کریم نے اسے بالحق سے تعبیر کیا ہے۔ حق کہتے ہی ٹھوس واقعہ کو ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس نے "شاعری" کو رسالت کے شایانِ شان قرار نہیں دیا۔

(۲) اسے ایسا نہیں ہونا چاہیئے کہ اس کا ایک حصہ دوسرے حصے کی تردید کرے اور اس طرح ان میں باہمی اختلاف ہو۔ یعنی اسے (Self-contradictory) نہیں ہونا چاہیئے۔
قرآن کریم نے اپنی صداقت کے لئے ثبوت یہ پیش کیا ہے کہ "اگر یہ خدا کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت سے اختلافات ہوتے (۴/۸۲)۔

(۳) وہ مفروضہ ایسا نہیں ہونا چاہیئے جو کسی پہلے سے ثابت شدہ حقیقت کی تردید کرے۔
قرآن کریم نے دین کے متعلق کہا ہی یہ ہے کہ یہ شروع سے اخیر تک اصولی طور پر ایک ہی چلا آیا ہے (۴۲/۱۳)۔ اسی لئے اس نے کہا ہے کہ سلسلۂ رسل کی ہر ایک کڑی کو منجانب اللہ سمجھا جائے اور ان میں کسی قسم کی تفریق نہ کی جائے۔

(۴) اس مفروضہ کو واضح، متعین اور ایسا نکھرا ہوا ہونا چاہیئے کہ وہ حقائق کی کسوٹی پر ہر وقت پرکھا جا سکے۔
قرآن کریم نے اپنے آپ کو مبین (واضح)، مفصل (نکھرا ہوا) اور غیر ذی عوج (۳۹/۲۸) بتایا ہے۔ یعنی ایسا جس میں کوئی پیچ و خم نہیں۔ وہ زمانہ کے ہر چیلنج کو قبول کرتا ہے جب کہتا ہے کہ فَاْتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۲/۱۱۱)۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اس کی تائید میں اپنے دلائل پیش کرو۔ اور اسے اپنی صداقت پر اس قدر یقین محکم ہے کہ وہ ساتھ ہی کہہ دیتا ہے کہ جو اس کی تردید کے لئے اکٹھے کالا بُرْهَانَهٗ (۲۳/۱۱۱)، اس کے پاس اپنے دعوے کی تائید میں کوئی دلیل نہیں ہوگی۔

آپ غور کیجئے کہ ابتدائی قوانین ــــ یعنی کسی امر کا سبب (Cause) دریافت کرنے کے لئے، سائنس نے مفروضات کے لئے بھی جو اصول مقرر کئے ہیں، قرآن کریم انہیں کس شرح و بسط سے بیان کرتا ہے۔
قرآن کریم کی دعوت یہ ہے کہ تم میری پیش کردہ صداقتوں کو بطور مسلمات تسلیم کر کے، عملی پروگرام شروع کر دو اور دیکھو کہ اس کے نتائج کس طرح ان مسلمات کی تصدیق کرتے چلے جاتے ہیں۔
اور اگر تم "ابتدائی قوانین" کے متعلق اپنے طے کردہ طریق کو اختیار کرنا چاہتے ہو، تو میرے دعاوی کو بطور "مفروضات" تسلیم کر کے، دیکھو کہ تمہیں، نتائج کس حقیقت تک پہنچاتے ہیں۔
لیکن جو لوگ اس کی بات پر دھیان ہی نہ دینا چاہیں، ان کے متعلق وہ کہتا ہے کہ وہ حقیقت تک

کس طرح پہنچ سکتے ہیں۔ انہی کو وہ کافر کہتا ہے۔ یعنی حقیقت تک پہنچنے کے لئے کسی سائنٹفک اصول کو تسلیم نہ کرنیوالا۔

لیکن ایک عام سائنٹسٹ اور قرآنی سائنٹسٹ میں فرق یہ ہے کہ

(۱) عام سائنٹسٹ کا دائرہ تحقیق و عمل، مادی دنیا تک محدود ہوتا ہے۔ وہ اگر نفس انسانی سے متعلق بھی گفتگو کرتا ہے تو اس سے اس کی مراد انسانی جذبات یا ادراک سے ہوتی ہے۔ لیکن قرآنی سائنٹسٹ کا دائرہ عمل و تحقیق، مادی دنیا کے علاوہ، انسانی ذات کو بھی محیط ہوتا ہے جو نہ طبیعی مشینری کی پیداوار ہے اور نہ ہی طبیعی قوانین کے تابع۔ وہ مستقل بالذات ہے اور انسان کے طبیعی جسم کے انتشار کے بعد بھی باقی رہتی اور آگے بڑھتی ہے۔

(۲) عام سائنٹسٹ کے قانونِ علت و معلول، کا دائرہ صرف طبیعی حوادث تک ہے۔ لیکن قرآنی سائنٹسٹ، اس کے ساتھ انسانی اعمال اور ان کے نتائج و اثرات سے متعلق بھی تحقیق کرتا ہے۔ اسے قانونِ مکافاتِ عمل کہا جاتا ہے۔

(۳) عام سائنٹسٹ کی دنیا صرف یہی عالمِ محسوس ہے۔ لیکن قرآنی سائنٹسٹ موت کے بعد کی زندگی پر بھی یقین رکھتا ہے اور اسے بھی اپنے غور و فکر کا موضوع بناتا ہے۔ (۲/۲۱۹)۔ اس کے قانونِ عمل کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

(۴) عام سائنٹسٹ یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتا ہے کہ اسے اتنا معلوم ہے کہ اساسی قوانین (AXIOMS) ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتا کہ کہاں سے آئے اور اس کا علم ہمیں کیسے ہوا۔ اس کے برعکس، قرآنی سائنٹسٹ یہ مانتا ہے کہ یہ قوانین اسی خدا کے وضع کردہ ہیں جو کائنات کا خالق ہے اور ان کا علم اُس نے خود ہی (بذریعہ وحی) انسانوں کو دیا ہے۔ اس طرح۔

(۱) خدا پر ایمان ——— جو اساسی مسلّمات کا خالق ہے۔

(۲) رسولوں پر ایمان ——— جن کی وساطت سے انسان کو ان مسلّمات کا علم ملا۔

(۳) کتابوں پر ایمان ——— جن میں یہ اساسی مسلمات مندرج تھے (اور اب ہیں۔ یعنی قرآن کریم)

(۴) ملائکہ پر ایمان ——— جو ان مسلمات کو بروئے کار لانے کے لئے خدا کی طرف سے پیدا کردہ قوتیں ہیں ——— اور

(۵) آخرت پر ایمان ——— یعنی قانونِ مکافاتِ عمل پر ایمان جو انسان کی اس دنیا کی اور اس کے بعد کی زندگی کو محیط ہیں۔ اس کے اساسی مسلمات میں شامل ہو جاتا ہے۔

اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن کریم کا انداز تحقیق، استدلال اور دعوت، سائنٹفک ہے۔ البتہ اس کا دائرۂ تحقیق و عمل، عام سائنٹسٹ کے دائرہ سے زیادہ وسیع ہے۔ لہذا قرآن کی رو سے عطا شدہ دین سائنس کا حریف نہیں۔ اس کا رفیق ——— اور رفیق اعلیٰ ——— ہے۔

اس کا کہنا یہ ہے کہ اگر تم ان مسلمات کو تسلیم کر کے "دنیا" میں چلو گے، تو تمہاری محنت ٹھکانے لگے گی۔ اور تم جگر پاش مشقتوں کے بغیر صحیح نتیجہ تک پہنچ جاؤ گے۔ لیکن اگر ایسا نہ کرو گے اور (Trial and error) کا تجرباتی طریق اختیار کرو گے۔ تو آخر الامر تم پہنچو گے تو اسی نتیجہ پر جس تک میں پہنچانا چاہتا ہوں لیکن اس میں تمہارا بہت زیادہ وقت ضائع ہوگا۔ بڑی محنت بیکار جائے گی۔ تمہیں خون کی ندیاں بہانی اور آگ کی خندقیں پھاندنی پڑیں گی۔ تمہیں عالمگیر خوں ریزیوں اور شعلہ فشانیوں کی تباہ کاریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ خدا کی طرف سے عطا کردہ مسلمات (قرآن کریم)، تمہیں ان تمام تباہیوں سے بچالیں گے۔ اب یہ تمہارے اپنے اختیار کی بات ہے کہ تم ان مسلمات کو صحیح تسلیم کر کے سفرِ زندگی اختیار کرتے ہو، یا تاریکی میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے آگے بڑھنا چاہتے ہو۔ تم جونسا راستہ جی چاہے اختیار کر لو لیکن اتنا سمجھ لو کہ روشنی میں چلنے والا اور تاریک راہیں اختیار کرنے والا دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔

(پرویز)

کراچی میں ادارہ طلوع اسلام کی مطبوعات

کراچی میں ادارہ طلوع اسلام کی شائع کردہ کتب محترم پرویز صاحب کی مطبوعات اور تحریک کا لٹریچر حسب ذیل پتہ مل سکتا ہے۔

محمد اسلام صاحب نمائندہ بزم طلوع اسلام ۴۰۰۱ لوئس روڈ نیو ٹاؤن کراچی

ٹیلیفون نمبر ۲۳۵۸۸۰

علاوہ ازیں ہر اتوار کی صبح کو سندھ اسمبلی ہال (بندر روڈ) کراچی میں پرویز صاحب کے درس قرآن کریم کے موقع پر بھی تحریک کا لٹریچر اور ضروری مطبوعات ——— مہیا کی جاتی ہیں۔

تین تازہ کتابیں

اسلامی معاشرت

جس کے تازہ ایڈیشن کا ایک مدت سے انتظار تھا۔ اس میں نہایت آسان زبان میں بتایا گیا ہے کہ ایک مسلمان کی روزمرہ کی زندگی کے متعلق قرآن کریم کے احکام کیا ہیں۔ بچوں کو صحیح اسلام کی تعلیم دینے کے لئے بڑی مفید کتاب ہے۔ اندازِ بیان سلیس اور دلچسپ

چیپ ایڈیشن — قیمت ۲ روپے

مقامِ حدیث

حدیث کا صحیح مقام کیا ہے۔ حدیثوں کو کس نے جمع کیا۔ یہ ہم تک کیسے پہنچیں۔ احادیث کے جو مجموعے ہمارے پاس ہیں ان میں کیا کچھ ہے رسول اللہ کی طرف ان کی نسبت کس حد تک صحیح ہے۔ علم حدیث کے متعلق اس ایک کتاب میں اسقدر معلومات ہیں جو آپکو بیسیوں کتابوں سے بے نیاز کر دیگی۔ چیپ ایڈیشن — قیمت ۴ روپے

بہارِ نو

پرویز صاحب کے مضامین کا مجموعہ۔ اسمیں بڑے اہم مضامین آگئے ہیں۔ حالات حاضرہ کے تقاضے، تعلیم جدید سے اسلام کیخلاف پیدا ہونے والے اعتراضات ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی الجھنیں، ان سب سے متعلق قرآن کریم کی تعلیم اور پرویز صاحب کا قلم۔ اس سے آپ ان مضامین کی اہمیت کا اندازہ کرلیں ؛

چیپ ایڈیشن — قیمت ۵ روپے

پتہ : ادارہ طلوعِ اسلام ۔ ۲۵ بی ۔ گلبرگ ۔ لاہور

چھاگلہ ازم

دین و دانش را غلام ارزاں دہد
تا بدن را زندہ دارد، جاں دہد

[یوں تو غدار، دنیا کے ہر ملک، ہر قوم اور ہر زمانہ میں پیدا ہوتے رہتے ہیں، لیکن جس قسم کے غدار، ہندوستان کے مظلوم مسلمانوں میں اسوقت پیدا ہو رہے ہیں، ان کی مثال شاید ہی کہیں اور مل سکے۔ ان میں، وہاں کی حکومت کے نام نہاد وزیر، مسٹر کریم بھائی چھاگلہ کا نام سرفہرست دکھائی دے گا۔ وہ قومی اور بین الاقوامی اسٹیج پر جسطرح ہندوؤں کے اشاروں پہ ناچ رہے ہیں اس کا تماشا ساری دنیا دیکھ رہی ہے۔ لیکن ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ مسلمانانِ ہند میں جہاں اس قسم کے غدار ہیں، وہاں اس قسم کے ارباب جرأت و ہمت بھی موجود ہیں جو ایسے نازک اور نامساعد حالات میں بھی حق گوئی سے ذرا نہیں چوکتے اور علی الاعلان وہ کچھ زبان پر لے آتے ہیں جو ان کا قلب محسوس کرتا ہے۔ اس قسم کے مردانِ حریت میں، لکھنؤ سے شائع ہونے والے جریدہ "تعمیرِ ملت" کے مدیر، محترم محمد الحسنی ہیں، جنہوں نے "چھاگلہ ازم" کے عنوان سے، اس غداریت کی نقاب کشائی کی ہے۔ ہم محترم حسنی صاحب کو ان کی اس حق گوئی و بے باکی پر مبارک باد دیتے ہوئے ان کے اس مقالہ کو "المنبر" کے شکریہ کے ساتھ شائع کرتے ہیں تاکہ مسلمانانِ پاکستان، اپنے ہندی بھائیوں کی طرف سے مایوس نہ ہوں اور ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ

بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی پوشیدہ ہیں۔

طلوع اسلام]

اس وقت ملّت اور ملک کو سب سے بڑا خطرہ اس مذہب مصلحت پرستی، مسلک ضمیر فروشی اور مذاق دریوزہ گری سے ہے جس کو ہم اپنی جدید اصطلاح میں "چھاگلہ ازم" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ محمد علی کریم بھائی چھاگلہ ہمیں معاف کریں، انہوں نے اتنے بہت سے "صفات و کمالات" کو اپنی واحد شخصیت میں سمو کر ہمارے لئے بہت آسانی پیدا کر دی ہے۔ اور آج ہم اس قابل ہیں کہ ان کو ایک مفرد لفظ میں ادا کر سکیں۔

ضمیر فروشی اور حق فروشی بلکہ زیادہ صحیح اور مختصر الفاظ میں "خود فروشی" دراصل ایک مستقل بالذات اور عالمگیر مذہب ہے۔ ہمارے ملک ہندوستان میں بھی اس مذہب و مسلک کے بہت سے نمائندے موجود ہیں لیکن اس کی سب سے اعلیٰ و ارفع سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور جدید ترین (ULTRA-MODERN) شکل یہی چھاگلہ ازم ہے جس نے آج خاصی تعداد میں اپنے حامی اور پیرو پیدا کر لئے ہیں۔

حمیت اور غیرت اس مذہب و مسلک کے حق میں سم قاتل ہے اور غیرت کی ایک لہر اور حمیت کی ایک جھلک اس پورے خرمن کو جلا دینے اور پورے سرمایہ و اندوختہ کو نیست و نابود کر دینے کے لئے کافی ہے۔ اس کے بانیان مذہب اور آئمہ فن نے ہر زمانہ میں اس سے مکمل پرہیز کی ہدایت کی اور اپنے متبعین و مقلدین کو اس سے برابر آگاہ و خبردار کرتے رہے۔ اس مذہب کے حامیوں اور پیروؤں کو مبارک ہو کہ آج ان کی صف سے ایک ایسے دلِ گردہ کا انسان سامنے آیا ہے جس نے غیرت کی اس مقدس و معصوم امانت کو سربازار رسوا کرنے اور اس کی ہر قسم کی امانت روا رکھنے کے بعد اس کو ہمیشہ کے لئے جلا وطن کر دیا ہے اور یہ پہلا اور آخری کانٹا بھی اب اس کی حلق سے نکل چکا ہے۔

"چھاگلہ ازم" ملّت اور ملک دونوں کے لئے خطرناک ہی نہیں بلکہ ان کے لئے "پیام موت" سے کسی طرح کم نہیں وہ اس امت کے لئے جو کائنات کے انتساب، اقوام عالم کی رہنمائی، انسانیت کی چارہ سازی، مظلوم کی مدد اور ظالم سے زور آزمائی، حق کی حمایت، اور باطل کے سامنے صف آرائی، کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

حقیقت ہے جسکے دیں کی انتساب کائنات

جس کے ابدی دین کی روح اور عالمگیر عظمت کا راز اور جس کے لئے خدا کا حکم اور قانون شریعت یہ ہے کہ وہ دنیا میں کسی جگہ ظلم و زور دستی۔ کسی کی حق تلفی گوارہ نہ کرے اور حق کے سامنے کسی مصلحت، شخصی مفاد اور کسی وعدہ و ضمانت کو خاطر میں نہ لائے۔ اس امت کو چند چمکتے ہوئے سکوں، وقتی اور سستی شہرت آسائش و آرائش کی ضمانت اور عہدہ و منصب کی ترقی کے لئے اپنے اصول اور اپنی شخصیت کا سودا کرنے اور اپنے اس جوہر عالی کو حکومتوں کی منڈی میں نیلام کرنے کی تلقین اس کی ایسی کھلی ہوئی توہین ہے جس کے لئے اس کو سراپا احتجاج اور سراپا درد ہو جانا چاہیئے اور شرمندگی کے ساتھ سر جھکا کر اعتراف کر لینا چاہیئے کہ اس کی صفوں میں "حق پرستوں" کے ساتھ

ساتھ جنہوں نے بارہا اس کے سر کو دنیا میں اونچا کیا اور عین مایوسی و شکستہ دلی کی حالت میں اس کی عزت رکھ لی ایسے حق فروش بھی موجود ہیں جنہوں نے اسی زمانہ میں اور اسی سطح پر اپنے عمل سے اس کی تردید کر دی اور اس کی آرزوؤں کو خاک میں ملا دیا۔

مسلمان اس وقت جس دور سے گذر رہے ہیں اور ان کو جن مسائل کا سامنا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ ان کو "قومی دھاروں" میں جذب ہو جانے اور نئے رجحانات کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ و ہم رنگ ہو جانے کے بجائے اس کی دعوت دی جائے کہ وہ نہ صرف اپنی تہذیبی خصوصیات اور اپنی شخصیت کو برقرار رکھیں بلکہ اس کے نوک پلک بھی درست کرتے رہیں اور اس کو برابر آراستہ و منظم بھی کرتے رہیں۔ وہ بغیر کسی جارحیت کے اپنی شخصیت کی تکمیل، بغیر کسی تنگ نظری کے اپنے تہذیبی عناصر و اجزاء پر اصرار اور بغیر کسی جذباتیت کے اپنے شعائر و خصوصیات کا مظاہرہ کرتے ہیں فخر محسوس کریں اور اس کے ساتھ بغیر کسی احساس خوف اور احساس کہتری کے ملک کے تعمیری کاموں اور فلاح و بہبود کی کوششوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔ ان کو اپنی تعلیم اپنے کلچر، اپنی دعوت، اپنے نظام زندگی، اپنے آداب و شعائر، اپنی خصوصیات اور اس ملک کے سیاسی، قومی، فکری، اور اقتصادی ڈھانچہ میں اپنی حیثیت اور اپنا مقام متعین کرنے اور مختلف مذہبوں اور تہذیبوں کے درمیان اپنی پوزیشن کو برقرار اور استوار رکھنے میں پوری طرح آزاد ہونا چاہیئے۔

چھاگلہ ازم خطرناک کیوں؟

"چھاگلہ ازم" مسلمانوں کے لئے خطرناک ہے کہ وہ ان تمام آزادیوں اور خصوصیتوں اور سحر انگیز اسلامی شخصیت کے مقابلے میں (جس میں آج بھی دلوں کو فتح کرنے اور ظلمتوں کو تجلیاں عطا کرنے کی طاقت ہے) ان کو خوشامد کا خوگر بناتا ہے۔ وہ ان کو ایک ایسی مصاحب اور حاشیہ بردار قوم میں تبدیل کرنا چاہتا ہے جو حکومت کی اداشناس اور اس کے ہر غلط اور صحیح فیصلہ پر تحسین و آفریں بلند کرتی رہے جس میں اس کو ہر ضرورت کے لئے سفیر، وزیر، ڈیلی گیٹ، ڈپلومیٹ، ادائس چانسلر، ایڈیٹر اور مصنف مل سکیں۔

وہ مسلمانوں کو ایک ایسی قوم کی حیثیت سے پیش کرتا ہے جس کا اس دنیا میں کوئی بڑا مقصد، اصول، ضمیر، شخصیت اور تہذیب نہیں۔ وہ دھاروں میں بہہ تو سکتی ہے لیکن دھاروں کو موڑنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

اس سے مسلمانوں میں بے اعتمادی، بدگمانی، خود فراموشی اور مایوسی اور جھنجھلاہٹ پیدا ہوتی ہے جو جس طرح ایک صحت مند قوم کے عقلی و ذہنی قویٰ کے لئے مضر ہے اسی طرح ایک ابھرتے ہوئے ملک کے لئے بھی بھی (جسکو ابھی بہت ترقی کرنا ہے) مہلک اور سم قاتل ہے

ذہنی صلاحیتوں کے لئے سم قاتل

اس سے مسلمانوں کی عملی اور ذہنی صلاحیتیں مفلوج، ان کا دل و دماغ افسردہ اور ان کے اعصاب شکستہ ہوتے ہیں،

وہ محسوس کرتے ہیں کہ جدوجہد کے سارے دروازے اور زندگی کے سارے راستے ان کے لئے بند ہیں۔ ان کی پرواز کے لئے فضا تنگ اور ماحول ناسازگار ہے وہ دیکھتے ہیں کہ اس "نئے ازم" کا سہارا لئے اور اس کا بیل لگائے بغیر وہ کسی بڑے عہدہ تک نہیں پہنچ سکتے اور ان کی کسی صلاحیت اور قابلیت کی کوئی قیمت نہیں سمجھی جاتی۔ وہ اس خانہ عشرت کے دروازے پر یہ بورڈ لگا ہوا دیکھتے ہیں۔

"لباس غیرت اتار دو اور آجاؤ"

اسلامی تہذیب کے خاتمہ کا علمبردار "چھاگلہ ازم"

وہ مسلمانوں کے لئے اس لئے خطرناک ہے کہ اس سے بالآخر اس تہذیب و ثقافت کا خاتمہ ہو جاتا ہے جو درحقیقت ان کے عقیدہ کا مرکز، ان کے ایمان و یقین کا ثمرہ، ان کی حق پرستی کا مظہر اور ان کے طرز فکر کا لباس ہے اور جس کے ہر شعبہ اور گوشہ میں اس کے جمال کی نمود ہے۔

مسلمانان ہند کا فرض

اس بدقسمتی کے سدباب کا (جو ہمارے اندر ہی سے ابھر رہی ہے باہر سے نہیں لادی جا رہی ہے) صرف ایک راستہ ہے اور وہ یہ کہ مسلمان اپنے قول اور اپنے طرز عمل سے ان کو باور کرا دیں کہ وہ اپنے دل کے کسی گوشہ میں ان کے لئے کوئی گنجائش نہیں رکھتے اور اگر وہ ان کے لئے اپنے دل میں کوئی جذبہ پاتے بھی ہیں تو وہ صرف نفرت اور تحقیر کا جذبہ ہے وہ ان کو محسوس کرا دیں کہ ان کو مسلمانوں میں کس نظر سے دیکھا جاتا ہے اور ان کو کس طرح یاد کیا جاتا ہے؟

وہ ان کو بتائیں کہ ایسے لوگوں کا ماضی بعید اور ماضی قریب میں کیا حشر ہوا؟ اور اس وقتی جاہ و شہرت اور اثر و دولت نے ان کو کہاں پہنچا کر دم لیا۔

وہ حکومت کو بھی اس بات سے آگاہ و خبردار کریں کہ یہ "نادان دوست" اس کی دردسری اور انتشار میں اضافہ کرنے کے سوا اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ وہ اپنے وقتی مصالح کے لئے اس کو گمراہ کر سکتے ہیں اور اس کی طرف سے خواہ مخواہ ایک پوری قوم کے اندر بدگمانی و نفرت کا بیج بو سکتے ہیں، وہ دلوں کو توڑنے کا کام تو کر سکتے ہیں دلوں کو ملا نہیں سکتے۔

وہ ایک عظیم اقلیت کو جس کے ساتھ اچھا سلوک کر کے، جس کی شخصیت کا اعتراف کر کے، جس کی حوصلہ افزائی کر کے، اور جس کے حقوق کو تسلیم کر کے بڑا کام لیا جا سکتا ہے اور ملک کو مستحکم بنایا جا سکتا ہے بوجوہ قیادت سے بدگمان اور برافروختہ کرنے کا وہ نامبارک اور ناخوشگوار فریضہ انجام دے رہے ہیں جس کی نزاکت اور خطرہ کا صحیح احساس آج کسی کو نہیں ہے

بھارتی حکومت سے!

حکومت کو بھی سمجھنا چاہیئے کہ وہ کیا پاکر کیا کھو رہی ہے، کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ چند مفاد پرست افراد (HEADS) کے مقابلہ میں وہ کروڑوں انسانوں سے بے پروائی برت رہی ہو؛ اور چند غرض مندوں کو خوش کرکے لاکھوں صحت مندوں کو ناراض کر رہی ہو۔ اگر کسی ایک زبان کے مسئلہ میں اور ایک یونیورسٹی کے مسئلہ میں جیت کر وہ لاکھوں کروڑوں دلوں کو ہار رہی ہو تو یہ اس کی فتح نہیں کھلی ہوئی شکست ہے۔ اس کا نفع نہیں کھلا ہوا نقصان ہے۔ ایسا نقصان جس کے لئے کسی تشریح کی ضرورت نہیں!

چھاگلہ ازم اگر مسلمانوں کے لئے مہلک اور سم قاتل ہے تو وہ حکومت اور اکثریت کے لئے بھی کسی طرح کم مضر اور خطرناک نہیں اس کی ہمت افزائی سے کسی کا بھلا نہیں اور سب کا نقصان ہے شخصی طور پر ان اشخاص سے جو اس ازم میں اپنی بہتری سمجھتے ہیں اور جنہوں نے شخصی مصالح، ذاتی اغراض، اور جاہ و شہرت کو۔ (خواہ وہ خراب ہی شہرت کیوں نہ ہو) اپنا معبود و مقصود بنا لیا ہے اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنی انسانیت کو بھی داغدار کیا ہے اور اپنی اسلامیت کو بھی، انہوں نے دنیا کے بازار میں اپنی وہ قیمت لگائی ہے جو جانوروں کی لگائی جاتی ہے اور اپنے کو اس طرح فروخت کیا ہے جس طرح سامان و اسباب فروخت کیا جاتا ہے ؎

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی
جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

کراچی میں پرویز صاحب کا درس قرآن کریم

سننے کے لئے

ہر اتوار کی صبح کو ۹ ۔ بجے سندھ اسمبلی ہال بندر روڈ

میں تشریف لائیے

ان سے اسلامی قوانین بنوایئے!

ہم کو اُن سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے!

پاکستان میں قانون سازی کا مسئلہ اٹھارہ برس سے گرداب میں پھنسی ہوئی لکڑی کی طرح ایک ہی جگہ گردش کر رہا ہے۔ ہمارا اقدامت پرست مذہبی طبقہ تعریضاً یہ کہتا ہے۔ کہ ارباب اقتدار چاہتے ہی نہیں کہ یہاں اسلامی قوانین رائج ہوں۔ اور ہمارا کہنا یہ ہے۔ کہ اس راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ خود ان مذہبی راہنماؤں کا وجود ہے جب تک ان حضرات کو اسلامی قانون کے معاملہ میں اتھارٹی تسلیم کیا جائیگا۔ اس وقت تک کوئی متفق علیہ ضابطہ مرتب نہیں ہو سکے گا۔ اس پر یہ حضرات تکفیر و تفسیق پر اتر آتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ کسی کو یوں گالیاں دینے سے حقیقت نہیں بدل جایا کرتی۔ وہ اپنی جگہ اٹل رہتی ہے۔ چنانچہ تاریخ اس کی شاہد ہے کہ ان حضرات نے جن لوگوں کے خلاف کفر و الحاد کے فتوے لگائے، یہی حضرات ان کے نام آج سلام و رحمت کے ساتھ لیتے ہیں اور فتوے لگانے والوں کو کوئی جانتا تک بھی نہیں۔ اسلامی مملکت میں اسلامی قوانین سے مراد یہ ہے کہ ایک ضابطہ قوانین تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر نافذ ہو — جیسا کہ عہد رسالت مآبؐ اور خلافت راشدہ میں ہوتا تھا — لیکن ہمارے ان مذہبی پیشواؤں کی حالت یہ ہوتی ہے۔ کہ ان میں سے کوئی دو بھی ایک بات پر متفق نہیں ہو سکتے۔ اس کی تازہ مثال ہمیں ماہنامہ "فکر و نظر" کی ستمبر ۱۹۶۵ء کی اشاعت میں ملتی ہے کسی صاحب نے یہ فتویٰ پوچھا کہ:

کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرع متین اس مسئلہ میں کہ ...

(۱) بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ: "احادیث میں جو طریق ذبح مذکور ہے، یعنی حلق اور لبہ پر چھری

چاقو وغیرہ دھاردار آلہ سے ذبح یا نحر کرنا" امر تعبدی" نہیں بلکہ امر عادی ہے عرب میں چونکہ اسی طرح جانور ذبح کئے جاتے تھے۔ اس لئے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی چند ھدایات کے ساتھ اسی طریق کو قائم رکھا۔ لہذا مسلمان یا کتابی "بسم اللہ اللہ اکبر" کہہ کر جس طریق پر بھی جانور ذبح کرلیں، ذبیحہ حلال ہوگا" یہ قول صحیح ہے یا غلط ؟

(۲) صنعتی ترقی کے اس مشینی دور میں انسان زیادہ سے زیادہ کام اپنے ہاتھ سے کرنے کی بجائے مشینوں سے لے رہا ہے۔ چنانچہ یورپ اور امریکہ میں ایسی برقی مشینیں ایجاد ہو گئی ہیں۔ کہ بہت سارے جانور اس کے نیچے کھڑے کر دیئے جاتے ہیں۔ اور ایک مرتبہ بٹن دبانے سے ان سب کی گردنیں کٹ جاتی ہیں۔

اگر بٹن دبانے والا مسلمان یا کتابی بسم اللہ اللہ اکبر کہہ بٹن دبائے تو یہ تسمیہ صحیح اور ذبیحہ حلال ہوگا یا نہیں ؟

اس استفتاء کا جواب ایک تو مفتی محمد شفیع صاحب نے دیا، اور دوسرا مفتی محمود صاحب نے یہ دونوں حضرات حنفی دیو بندی ہیں اور علماء میں بڑی ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ لیکن دونوں کے جواب ایک دوسرے کی تردید کر رہے ہیں۔ مفتی محمد شفیع صاحب کے فتوے کا خلاصہ یہ ہے کہ

(۱) اگر مشین کی چھری گردن پر رکھنے والے نے بسم اللہ کہہ کر چھری رکھی ہے۔ تو گو غیر مشروع طریقہ سے ذبح کرنے کا گناہ ہوا۔ مگر گوشت حلال ہوگا ـــــ ادھ

(۲) مشینی ذبح کے عمل میں صرف وہ جانور حلال سمجھے جائیں گے جن پر چھری بیک وقت پڑے بشرطیکہ مشین کی چھری چلاتے وقت بسم اللہ پڑھ لی گئی ہو۔

اس کے برعکس ـــ مفتی محمود صاحب نے یہ فتوے دیا کہ

بٹن دبانیوالا مسلمان بھی ہو اور بٹن دبانے وقت تسمیہ بھی پڑھے۔ تب بھی مشین کے مروجہ ذبیحہ کو حلال نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ وہ مردار ہی ہے۔

یعنے ایک ہی مسلک اور ایک ہی مکتب فکر کے دو عالم ایک دوسرے کے خلاف فتوے دے رہے ہیں۔ ایک اُس گوشت کو حلال بتایا ہے اور دوسرا اسے حرام ٹھہراتا ہے۔ فرمائیے! ان میں سے کس کا فیصلہ اسلامی قانون کہلائیگا۔

مفتی محمود صاحب نے اپنا جواب دیتے وقت مفتی محمد شفیع صاحب پر طنز و تعریض کی ہے۔ اس کا نمونہ بھی دیکھتے جائیے۔ فرماتے ہیں۔

بینات بابت ماہ ذی قعدہ ۱۳۸۵ھ میں "ذبح کا مسنون طریقہ" کے عنوان کے تحت حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب صدر دارالعلوم کراچی کا فتوے نظر سے گزرا۔ حضرت مفتی صاحب جیسی عظیم و معروف علمی شخصیت کے اس فتوے سے یورپ و امریکہ کے ممالک میں مروج طریق پر، جس کا اسلامی ذبح سے کوئی علاقہ نہیں۔ اسلامی ذبح کی مہر تصدیق ثبت ہو گئی۔ اور پاکستانی "مستغربین" جو آج تک مشینی ذبح کے طریق کو ملک میں رائج کرنے سے اس لئے کتراتے رہے۔ کہ علماء کرام ایسے ذبیحہ کی حلت اور عام استعمال میں رکاوٹ بنیں گے۔ آج آپ سے آپ ان کی مشکل آسان ہو گئی۔ اور جو صورت حال ان کے لئے سوہان روح بنی ہوئی تھی۔ اور ہر قیمت پر وہ اس سے نمٹنے کی تدبیریں سوچ رہے تھے۔ آج ان کے راستہ کا وہ سنگ راہ ہٹا دیا گیا۔

یہ ان حضرات کا انداز گفتگو خود آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ہے۔ تا بدیگراں چہ رسد!

فرمائیے! ان حضرات کو اختیاری قرار دیتے ہوئے، کوئی ضابطہ قوانین ایسا ہو سکتا ہے جس پر مختلف فرقوں کے علماء تو ایک طرف، خود ایک فرقہ کے نمائندے بھی متفق ہوں۔ اور جس کا اطلاق تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو سکے۔؟

زندگی کی گذرگاہوں پر

بڑے بڑے نازک موڑ سامنے آتے ہیں۔ ہر ایسے موڑ پر اگر حقیقی منزل کی نشاندہی کا سامان نہ ہو تو قوموں اور امتوں کے قافلے ہلاکت اور بربادی کا رخ کر لیتے ہیں۔ قرآن کریم نے ان مرحلوں پر اصولی راہنمائی پیش کی ہے پرویز صاحب کے مضامین اور خطابات کا بصیرت افروز سلسلہ جو

سلسبیل

کے نام سے شائع ہوا ہے۔ قرآن کی اسی اصولی راہ نمائی کے مختلف گوشوں کی تفصیل ہے۔

سلسبیل کے مطالعہ سے زندگی کے بہت سے پیچیدہ مسائل کا حل ابھر اور نکھر کر سامنے آتا اور قرآن کی عظمت و صداقت کی شہادت بنتا چلا جاتا ہے۔

پتہ:۔ ادارہ طلوع اسلام ۲۵/بی گلبرگ لاہور فون

خورشید عالم

دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا!

قوموں کے حق خودارادی کا چرچا یوں تو پہلی عالمگیر جنگ کے دوران ہوا۔ اور اس اصول کی بنا پر بعض ممالک معرضِ وجود میں بھی آگئے۔ لیکن ممالک محروسہ کی آزادی کی رفتار نمایاں طور پر تیز دوسری جنگ عظیم کے بعد ہوئی — پاکستان اور بھارت عالمی نقشے پر ابھرے۔ انڈونیشیا آزاد ہوا۔ سابقہ ہند چینی سے فرانس بے دخل ہوا۔ سنگاپور ملایا اقوام عالم کی صف میں بار پا گئے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سارے کا سارا براعظم افریقہ غیر ملکی غلامی سے نجات حاصل کر گیا، یہ کہا جا سکتا ہے۔ اور کہا گیا ہے۔ کہ غلام ممالک کے آزاد ہونے سے استعمار شرنگ اسی تناسب سے پسپا ہوا۔ لیکن اب اندازہ ہونے لگا ہے۔ کہ استعمار نے اپنا چولا بدلا ہے۔ اس نے پسپائی اختیار نہیں کی نہ ہی شکست تسلیم کی ہے۔ وہ ایسا نیا اور دلفریب لبادہ اوڑھ کے پھر سے آدھمکا۔ کہ پرانا رہزن نیا رفیقِ سفر نظر آنے لگا

حکمران یورپی اقوام نے مشرقی ممالک محروسہ کو اس قدر لوٹا۔ اور انہیں اس حد تک اپاہج بنا دیا۔ کہ وہ آزاد ہو کر بھی اپنے آپ میں آنے کے قابل نہیں رہے۔ وہ قدم قدم پر اپنے آپ کو سابقہ سیاسی آقاؤں کا دستِ نگر پاتے ہیں اور ان سے امداد کے طالب ہوتے ہیں۔ انہیں مدد ملتی ہے۔ تو ہزار احسان جتا کر۔ اس پر طرہ یہ کہ اس امداد کے ساتھ یورپی اقوام کے ایسے ماہرین آتے ہیں۔ جو امداد کی بیشتر رقوم گراں قدر مشاہروں کی صورت میں اپنے وطن واپس لے جاتے ہیں۔ اس طرح متعلقہ مشرقی ممالک زیر بار بھی ہوتے ہیں۔ اور سیاسی اثر قبول کرنے پر بھی مجبور ہوتے ہیں — امداد کے زور پر دوسرے ممالک کو زیر اثر لانے میں امریکہ خصوصیت سے پیش پیش ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ سے پہلے یہ ملک آزادیٔ اقوام کا علمبردار سمجھا جاتا تھا۔ امریکہ خود بھی لڑ کے آزاد ہوا تھا۔ اور غلام ممالک سے ہمدردی جتانے میں بھی پیش پیش تھا۔ لیکن کل تک جس امریکہ کی طرف غلام اقوام بڑی توقعات باندھ کے دیکھا کرتی تھیں۔ آج اسے وہ استعمار کی علامت سمجھنے لگ گئی ہیں۔

امریکہ بڑا دولت مند اور طاقت ور ملک ہے۔ اس میں شبہ نہیں۔ کہ وہ انتھک محنت سے اس غیر معمولی

مقام پر پہنچا ہے۔ اس نے خون پسینہ ایک کیا۔ اور بے شمار دولت اور بے پناہ قوت حاصل کی۔ لیکن اس دولت اور طاقت کو وہ جس طریق سے استعمال کر رہا ہے۔ اس سے وہ آزادی کی علامت نہیں رہا۔ بلکہ استعمار کا نشان بن گیا ہے۔ شمالی اوقیانوس کی نام نہاد دفاعی تنظیم قائم کر کے وہ برسوں سے مغربی یورپ کی اقوام کو اپنے سایئے تلے جمع کر رہا ہے۔ اس کا ایک بیڑہ بحر روم میں عرصے سے گشت کر رہا ہے۔ ایک بیڑہ جنوبی چینی سمندر میں پڑا ہے۔ ایک اور بیڑہ اس سمندر میں آموجود ہوا ہے۔ جسے "بحر ہند" کے کثیر غلط نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بحر الکاہل میں جگہ جگہ اس کے سمندری اڈے ہیں۔ بیڑوں کی اس ترتیب و تقسیم کو نقشے پر دیکھا جائے۔ تو صاف دکھائی دے گا۔ کہ دنیا کے پانچوں براعظم امریکہ کی زد یا گرفت میں ہیں۔ یہ پوچھا جائے۔ کہ امریکہ کو اس اہتمام کی آخر ضرورت کیوں لاحق ہوئی۔ تو وہ سادگی سے کہہ دے گا۔ کہ یہ بندوبست اشتراکیت کو روکنے کے لئے کیا گیا ہے۔ یہ ماننا مشکل ہے۔ کہ امریکہ ایسا خدائی فوجدار ہے کہ جسے یہ حق پہنچتا ہے۔ کہ وہ دوسری اقوام کو اشتراکی ہونے زبردستی روکے۔ اس امریکی روش کے خطرات بالکل واضح ہیں۔ مثلاً جنوبی چینی سمندر میں امریکہ کا بیڑا اس لئے پڑا ہے۔ کہ چین فارموسا جزیرے کو پھر سے حاصل نہ کر سکے۔ اور امریکہ پوری ڈھٹائی سے اس جزیرے کو چین یا چین کا بدل کہتا اور منواتا چلا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے۔ کہ مشت خاک جزیرہ فارموسا وسیع و عریض چین کی بجائے اقوام متحدہ کا رکن ہے۔ یعنی فارموسا دنیا کی پانچ بڑی اقوام میں شمار ہوتا ہے۔ اور سلامتی کونسل کا اس طرح مستقل رکن ہے۔ جس طرح روس، امریکہ، برطانیہ اور فرانس ہیں۔ اور ان ممالک ہی کی طرح فارموسا کو حق استرداد بھی حاصل ہے۔ یہ ایک بین الاقوامی ڈھونگ ہے۔ لیکن اسے حقیقت ثابت کرنے کے لئے امریکہ کے پاس سب سے بڑی دلیل اس کی غیر معمولی طاقت ہے۔

اس سے اقوام متحدہ میں چین کی نشست پر چین کو بٹھانے کے لئے ہر سال جو جتن کئے جاتے ہیں۔ وہ بجائے خود ہے۔ امریکہ کے بیڑے کی موجودگی سے چین کے علاوہ ویٹ نام۔ لاؤس، کیموڈیا، انڈونیشیا وغیرہ ممالک ہر وقت خطر سے دوچار رہتے ہیں۔ یعنی کسی دن بھی ایسا ہو سکتا ہے کہ امریکہ اپنا بیڑہ لے کر ان کے سواحل تک پہنچ جائے اور ان سے بزور اپنی مرضی منوا لے۔ اور ان کے داخلی معاملات میں دخیل ہو۔ ویٹ نام کے خلاف تو یہ بیڑہ استعمال ہو رہا ہے۔ یہ بیڑہ دوسرے ممالک کے خلاف اسی طرح استعمال ہو سکتا ہے۔ لہذا جب تک یہ بیڑہ موجود ہے۔ کوئی ملک اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھ سکتا۔ یہ غیر ملکی تسلط اور استعماریت ہی کی دوسری شکل ہے۔ لیکن اسے استعماریت سمجھنے میں دشواری اس لئے ہو رہی ہے۔ کہ غیر ملکی تسلط سے مراد بری قبضہ لیا جاتا رہا ہے۔ مثال کے طور پر برطانیہ ہمارے برصغیر پر قابض تھا۔ تو اسے برطانوی استعمار قرار دیا جاتا تھا۔ فرانس کی ہند چینی پر گرفت تھی تو اسے فرانسیسی استعمار سمجھا جاتا تھا۔ لیکن سمندر پر قبضے کو استعمار تصور نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ اب سمندر کا استعمال بالکل ویسے ہی ہونے لگا ہے۔ جیسے پہلے زمین کا ہوا کرتا تھا۔ اب امریکہ جنوبی چینی سمندر پر قابض ہے تو اس سے وہ تمام خطرات پیدا ہو گئے ہیں جو اس

سمندر کے خشکی ہونے کی صورت میں امریکہ کے تسلط میں چلے جانے سے پیدا ہوتے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پانی کے لئے اس حق خود اختیاری کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ جو زمین کے ٹکڑے کے لئے انسانی آبادی کی بنا پر پیدا ہوتا ہے۔ استعمار کی یہ بحری صورت اس لئے نکل آئی ہے۔ کہ ساز و سامانِ جنگ ایسا تیار ہو گیا ہے۔ جس کے استعمال کے لئے زمین کی ضرورت نہیں رہی۔ اس سے علاقائی آزادی اور خود اختیاری کا مسئلہ پس پشت چلا گیا ہے۔ یعنی امریکہ زمین کے کسی ٹکڑے پر قبضہ کرلے تو ہزار باتیں بنیں گی۔ لیکن وہ سمندروں میں دندناتا پھرے۔ تو کوئی آسانی سے اس کا مزاحم نہیں ہوگا۔ کیونکہ عام کھلے سمندر کسی کی علاقائی تحویل میں نہیں۔

امریکہ نے سمندری فتوحات کا سلسلہ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد شروع کیا۔ کیونکہ فرنگی مقبوضات پے در پے آزاد ہونے لگیں اور یہ نظر آنے لگا۔ کہ مغرب کا اثر و اقتدار کم ہو جائیگا۔ اور اس خلاء کو اشتراکیت پُر کرے گی۔ چنانچہ امریکہ نے شمالی اوقیانوس سے لیکر جنوب مغربی ایشیا تک جو دفاعی انتظامات کئے وہ سارے کے سارے اشتراکیت کے خلاف تھے۔ ان انتظامات میں اس نے دوسری اقوام بالخصوص ایشیائی اقوام کو اپنی شرائط پر شریک کرنے کی کوشش کی۔ تو رفتہ رفتہ اُسے پتہ چلا۔ کہ ان اقوام کو اشتراکیت سے ایسا خدا واسطے کا بیر نہیں کہ وہ امریکہ کا خلوص دل سے ساتھ دیں اس سلسلے میں پاکستان کی مثال خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ پاکستان سیٹو میں شامل ہوا۔ لیکن اس نے پہلے دن ہی اس اختلافی رائے کا اظہار کر دیا۔ کہ جارحیت سے مراد ہر قسم کی جارحیت ہے۔ اور صرف اشتراکی جارحیت کے خلاف پیش بندی کرنا دانشمندی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیٹو اور سنٹو کے معاہدات مؤثر فوجی تنظیموں کی حیثیت اختیار نہیں کر سکے۔ ان میں شریک ایشیائی اقوام آزادانہ اپنے علاقائی استحکام اور دفاع کی منصوبہ اور کوشاں رہیں۔ لیکن ان کے برعکس امریکہ انہیں اپنے مقاصد کے لئے اشتراکیت کے خلاف تیار کرنے میں ساعی رہا۔ چنانچہ دونوں تنظیمیں ناٹو جیسی مغربی تنظیم کے مقابلے میں بے جان اور بے اثر رہیں۔

اس سے امریکہ نے یہ نتیجہ نکالا۔ کہ علاقائی اقوام پر زیادہ تکیہ نہ کیا جائے اور ان کی علمی رفاقت حاصل کرنے کی بجائے برائے نام رفاقت کو کافی سمجھا جائے۔ ویٹ نام میں کوئی علاقائی قوم اس کے ساتھ نہیں۔ خود ویٹ نام اسکے ساتھ نہیں۔ ویٹ نام کے دو حصے ہیں شمالی ویٹ نام اشتراکی ہے۔ اور امریکہ اس کے خلاف صف آرا ہے۔ جنوبی ویٹ نام کا کوئی اسّی فی صد علاقہ حریت پسندوں کے قبضے میں ہے۔ امریکہ بیان بظاہر جنوبی ویٹ نام سے مل کر حریت پسندوں اور شمالی ویٹ نام کے خلاف لڑ رہا ہے۔ لیکن جنوبی ویٹ نام کی نہ تو کوئی قابل ذکر حکومت اور نہ کسی منظم اور مستحکم حکومت کی اسے حمایت حاصل ہے۔ دراصل امریکہ جو مہرہ آگے بڑھاتا ہے۔ وہ پہلے ہی پٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ انہیں وہ حکومت کہتا ہے۔ اور اپنی فوجی قوت کے زور پر چند دن ان سے کھیل کھیلتا ہے۔ پھر اور مہرہ آجاتا ہے۔ یہ سلسلہ برسوں سے جاری ہے۔ ..... گویا جنوبی ویٹ نام باقاعدہ امریکہ کا مقبوضہ تو

نہیں لیکن امریکہ اس میں داخل ہوکر اپنے مزعومہ دشمنوں سے لڑ رہا ہے۔ اگر ویٹ نام امریکہ کا مقبوضہ ہوتا۔ تو امریکہ کے پاس اس کے اندر یا اس کے لئے لڑنے کے لئے کچھ تو جواز ہوتا۔ اب اتنا جواز بھی نہیں۔ لیکن اس سے یہ خطرناک تر صورت سامنے آگئی ہے۔ کہ امریکہ طاقت کے زور پر کسی بھی ملک میں داخل ہوسکتا ہے۔ اور لڑائی کی طرح ڈال سکتا ہے۔ یعنی جو کچھ ویٹ نام میں ہوا۔ اور ہو رہا ہے۔ وہ ہر چھوٹے اور کمزور ملک میں ہوسکتا ہے۔ یہ خطرہ ان ملکوں کے لئے کہیں زیادہ ہوگا۔ جو نام نہاد بحرِ ہند کے آس پاس بستے ہیں۔ اور امریکی بیڑے کی زد میں ہے۔

امریکہ چین کے خلاف لڑ رہا ہے۔ پہلے تو وہ خود چین کے اندر ابھرتی ہوئی اشتراکیت کے ہاتھوں پٹا۔ پھر اسے کوریا میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اب وہ ویٹ نام میں ہاری ہوئی جنگ لڑ رہا ہے۔ ان پیہم شکستوں سے وہ کوئی سبق نہیں سیکھ رہا۔ بلکہ اس کی نظریں بھارت پر جم گئی ہیں۔ وہ سمجھتا ہے۔ کہ بھارت قابو میں آجائے۔ تو چین کے خلاف فیصلہ کن محاذ قائم ہوسکتا ہے۔ بھارت کے دماغ میں ایسا خناس سمایا ہوا ہے۔ کہ وہ پوری طرح امریکہ کا آلۂ کار بن گیا ہے۔ وہ چاہتا ہے۔ کہ اس بہانے امریکہ سے ہر طرح کی مدد لے کر وہ اپنے آپ کو اتنا طاقتور بنالے کہ اس کے ہمسائے اس کا دم بھریں۔ وہ اس خلا کو پُر کرنا چاہتا ہے۔ جو دوسری عالمی جنگ کے بعد اقوامِ مغرب کے سیاسی اثر و نفوذ کے گھٹنے سے پیدا ہوا۔ امریکہ بھی اسی خلا کو پُر کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ امریکہ اور بھارت میں رقابت بھی ہے اور تعاون بھی۔ مشترک استعماری عزائم نے دونوں میں قدرِ مشترک تو پیدا کر دی ہے۔ لیکن امریکہ جیسے ترقی یافتہ اور بھارت جیسے پس ماندہ ملک میں اس بنا پر تعاون کا مطلب ایک ہی ہوسکتا ہے۔ اور وہ یہ کہ بھارت امریکہ کا طفیلی بن جائے۔ اور بھارت کے ذریعے امریکی استعمار پھیلے۔ بھارت عملاً امریکی استعمار کا آلۂ کار بن چکا ہے۔ وہ چین کی سرحد پر کشیدگی بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ تاکہ چین کے خلاف امریکہ اسے دل کھول کر مدد دے اور وہ اس مدد کو پاکستان کیخلاف استعمال کرے۔ اور کشمیر پر اپنا قبضہ جمائے رکھنے میں کامیاب رہے۔

یہ صورتِ حال ایسی ہے۔ کہ پاکستان پر اس کی براہ راست زد پڑتی ہے۔ لیکن یہ صورت ایشیا اور افریقہ کی اقوام کے لئے کم سنگین نہیں۔ گو جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے۔ امریکہ نے تمام سمندروں میں اپنے بیڑے تعین کر رکھے ہیں۔ تاہم اس کی توجہ ایشیا اور افریقہ پر مرکوز ہوتی جاتی ہے۔ امریکہ اچھی طرح جانتا ہے۔ کہ اس کے اور روس کے پاس ہلاکت و بربادی کا کس قدر سامان ہے۔ اس کی انتہائی کوشش یہ ہے۔ کہ اس کا روس سے تصادم نہ ہو۔ کیونکہ اس میں اسے اپنی یقینی تباہی نظر آتی ہے۔ چنانچہ وہ روس کو اپنی طرف مائل کرکے چین کو نشانہ بنانے کی فکر میں ہے۔ تاکہ میدانِ جنگ ایشیا بنے۔ اور تباہی ایشیا بالخصوص چین تک محدود رہے۔ چونکہ اسے بھارت کے ذریعے مطلب پورا ہونے کی صورت نظر آرہی ہے۔ اس لئے وہ بحری ساز و سامان لے کر اس سمندر میں پہنچ گیا ہے۔ جس کے کنارے ایشیا اور افریقہ آباد ہیں۔ اس سمندر میں امریکی بیڑہ لانے کا موجب صرف بھارت ہوا

ہے۔ اگر اس کا دماغ خراب نہ ہوتا۔ اور اسے ایشیائی افریقی برادری کا پاس ہوتا۔ تو وہ چین کا ہوّا کھڑا کر کے امریکہ کو اپنے ہاں آنے کی کھلی چھٹی نہ دے دیتا۔ پنڈت نہرو جیسا آدمی جو اپنے آپ کو ایشیائی غیرت کی علامت سمجھاتے پر مصر تھا۔ یہاں تک آمادہ ہو گیا تھا۔ کہ امریکہ بھارت کو ایک ہزار کلوواٹ کا ٹرانسمیٹر دے دے اور نقد قیمت وصول کرنے کی بجائے اس ٹرانسمیٹر کو ہر روز ایشیا میں اپنے پروپیگنڈے کے لئے استعمال کر لیا کرے یہ اتنا مکروہ سودا تھا کہ بالآخر پنڈت جی کو معاہدہ کرنے کے باوجود اس سے باز رہنا پڑا۔ اس سے بھارت کو یہ بھی اندازہ ہو گیا۔ کہ ایشیائی افریقی رائے عامہ کس قدر حساس ہے۔ چنانچہ پینترا بدل کر غیر جانبداری کا بھرم یوں قائم رکھنے کی کوشش کی گئی۔ کہ امریکہ کی طرح روس بھی اتنا طاقتور ٹرانسمیٹر بھارت کو دے دے۔ اسی پس منظر میں یہ تصور بھی ابھرا کہ امریکہ بھارت میں قدم جمانے اور اڈے بنانے کی بجائے اپنے عالمی اڈوں کو اس طرح منظم اور تیار کرے کہ ضرورت پڑنے پر بھارت کو ہر طرح کی مدد پہنچائی جا سکے۔

معاملہ یہاں تک پہنچا۔ تو بھارت کے جنوبی سمندر میں امریکہ کا بیڑہ آ موجود ہوا۔ اس بیڑے کی آمد پر پنڈت نہرو کا ردِ عمل دیکھ کر صاف پتہ چلتا تھا۔ کہ بیڑا آیا نہیں لایا گیا ہے۔ بہرحال اس بیڑے کو ٹکنے کا بہانہ تو بھارت نے مہیا کیا۔ لیکن اس کے لانے میں برطانیہ کا بھی خاصا ہاتھ ہے۔ اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے اسے سمندری اڈوں کی ضرورت ہے۔ بحر قلزم اور خلیج فارس میں اس کے اڈے موجود ہیں۔ لیکن اس سے آگے سنگاپور تک اس کے پاس سیلون کے جنوب مغرب میں مالدیو جزائر میں ایک اڈہ ہے جو بالکل ناکافی ہے۔ نیز اسے ڈر ہے اور ڈر بالکل حقیقی ہے کہ مقامی رائے عامہ زود یا بدیر ان اڈوں میں اس کی پوزیشن مخدوش بنا دے گی اور اسے بالآخر ان کو چھوڑ دینا ہوگا۔ چنانچہ اس نے امریکہ کے کان میں یہ بات ڈالی کہ بحر قلزم سے آسٹریلیا کے درمیانی وسیع و عریض سمندر کو خالی نہ رہنے دیا جائے۔ اس کے بدلے میں برطانیہ استعماری پالیسی میں امریکہ کی ہاں میں ہاں ملانے کے لئے تیار ہو گیا ہے۔ امریکی بیڑے کی سہولت کے لئے برطانیہ نے حال ہی میں چار چھوٹے جزیرے حاصل کئے ہیں۔ یہ جزیرے جو مورشیس اور سیچلیس کی حکومتوں سے لئے گئے ہیں مالدیو جزائر کے جنوب میں ہیں۔ انہیں اصل علاقوں سے علیحدہ کر لیا گیا ہے۔ اور ان میں کوئی آبادی نہیں تاکہ کل کو کسی قسم کے حق خود اختیاری کا سوال پیدا نہ ہو۔ چونکہ یہ صورتِ حال بہت حد تک بھارت کے کردار کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے اس لئے یہ بالکل بعید از قیاس نہیں۔ کہ امریکی بیڑے کو بھی ان جزائر میں آنے جانے کی سہولت ہو جو اتفاقاتِ زمانہ سے بھارتی تحویل میں آ گئے ہیں۔ یہ جزیرے ہیں لکادیپ، انڈمان اور نکوبار۔

یہ بیڑہ جارحانہ استعماری عزائم لے کر بحرِ "ہند" میں آیا ہے۔ لہٰذا موقع آنے پر یہ کسی بھی ملک کی ناکہ بندی کر سکتا ہے اور ظاہر ہے۔ کہ ناکہ بندی اسی ملک کی ہوگی جو امریکہ کی عالمی پالیسی سے اتفاق نہیں کریگا۔ اس وقت بہت سے ممالک ایسے ہیں جو امریکہ کی خلافِ چین پالیسی کو دل سے ناپسند کرتے ہیں۔ ان ملکوں کو کسی وقت سزا کا

مستوجب قرار دیا جاسکتا ہے۔ پھر اس سمندر کے کنارے بھارت جیسا بے اعتبارا ملک ہو۔ تو ایسی آزمائش کا وقت بیٹھے بٹھائے آسکتا ہے ظاہر ہے کہ کوئی ایشیائی افریقی ملک یہ پسند نہیں کریگا کہ یہ خطرہ باقی رہے۔ استعمار کی اس نئی صورت کو جلد از جلد ختم ہونا چاہیئے لیکن معاملہ اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ اس کے لئے مشترکہ جدوجہد کی ضرورت ہوگی۔ اس کے لئے ایک کرنے کا کام یہ ہے کہ اس سمندر کا نام بدل دیا جائے۔ "بحر ہند" کہنے سے اس کی مناسبت صرف ایک ملک سے ہو جاتی ہے۔ حالانکہ وہ ان بیسیوں ملکوں میں سے ایک ہے جو اس سمندر کے کنارے آباد ہیں یہ سمندر جس "ہند" کی مناسبت سے یاد کیا جاتا ہے وہ تو اٹھارہ سال پہلے ختم ہو چکا ہے۔ وہ نسبت رکھی جائے تو اسے بحر "ہند و پاک" کہنا چاہیئے۔ لیکن یہ انتساب بھی محدود ہوگا۔ اس سمندر کے کنارے بہت سے ایشیائی افریقی ممالک آباد ہیں۔ یہ ممالک کل تک گمنام تھے لیکن آج وہ آزاد اور با اختیار ہیں۔ اب ان کی حیثیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے مناسب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسے "بحر افریشیا" کے نام سے یاد کیا جائے۔ عرصہ ہوا انڈونیشیا نے اس بحر کا نام بحر انڈونیشیا رکھ لیا تھا۔ وہ غالباً اب بھی اسے اسی نام سے پکارتا ہے۔ لیکن بہتر یہی ہے کہ اس کا انتساب وسیع تر ہو۔ اس کے لئے "بحر افریشیا" زیادہ موزوں نام ہے اور بدلے ہوئے حالات سے زیادہ سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔

نام بدلنے سے ہی اس بحر سے متعلق تصور بدلنے لگے گا اور ساحلی ممالک یہ جاننے لگ جائیں گے کہ ان کا اس سمندر سے گہرا تعلق ہے۔ لہٰذا اس کے تموج سے وہ براہ راست متاثر ہوں گے۔ نام کوئی ملک انفرادی طور پر نہیں بدل سکے گا۔ یہ کام مل کر کرنے کا ہے۔ اگر مل کر نام بدل لیا جائے۔ تو اس بحر سے متعلق ایک مشترکہ پالیسی متشکل کرنا نسبتاً آسان ہو جائے گا۔ اسی پالیسی کی بنیاد پر یہ مطالبہ ہونا چاہیئے۔ کہ کسی قوم یا ملک کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس سمندر کو اپنے استعماری عزائم کی جولانگاہ بنائے۔ اور اگر کوئی ایسا کرے گا۔ تو اسے متفقہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ یہ غنیمت ہے کہ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اس کی صدائے بازگشت سنی گئی ہے اس ایوان میں اڈے بنانے پر گہری تشویش کا اظہار کیا جا چکا ہے۔ ایشیا اور افریقہ کی قومیں یہ فیصلہ کرنے میں یقیناً حق بجانب ہوں گی کہ امریکہ افریشیائی سمندر سے اپنا بیڑہ واپس بلا لے۔ یہ مطالبہ کرتے ہوئے اسے جتا دیا جائے۔ کہ اگر اس نے بیڑہ واپس بلانے میں لیت و لعل کیا۔ تو اسے استعماریت اور جارحیت متصور کیا جائے گا۔ اور اسی اعتبار سے اس کا مقابلہ کیا جائے گا۔ یہ مہم جتنی مؤثر ہوگی۔ اسی قدر اس کا امکان بڑھے گا کہ کشیدگی کم ہو۔ مزید برآں اس کی بھی گنجائش پیدا ہوگی کہ امریکہ طاقت کے بل بوتے پر دوسروں کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہ کر سکے۔ یہ درست ہے کہ امریکہ آسانی سے اس سمندر سے بے دخل نہیں ہوگا۔ لہٰذا اب اس بحری استعمار کے خلاف رائے تیار کرنے کے ساتھ ساتھ اس

کے عملی اقدام کی بھی ضرورت ہوگی۔ کہ بحرِ افریشیا افریشیائی اقوام کی جولانگاہ بنے۔ یعنی اس میں زیادہ سے زیادہ تجارتی اور جنگی جہاز افریشیائی ممالک کے ہوں۔ بحالات موجودہ یہ ممالک انفرادی طور پر مؤثر بحری بیڑے تیار کرنے کے قابل نہیں۔ لیکن وہ آمادہ بہ تعاون ہوجائیں۔ تو ان کی ناقابلیت ختم نہیں ہوجائے گی تو اتنی کم ضرور ہوجائے گی کہ وہ موثر عملی اقدامات کرسکیں۔ اور ایک مشترکہ افریشیائی بیڑے کی منصوبہ بندی بھی کرسکیں اور اس کی داغ بیل بھی ڈال سکیں۔ بحرِ افریشیا کے شمال مشرق، شمال، شمال مغرب، اور مغرب میں جو ممالک آباد ہیں۔ ان کے استحکام اور ان کی سالمیت کا تقاضا ہے کہ ان کے پاس مضبوط بحری بیڑہ ہو۔ وہ باہمی تعاون سے اس کمی کو پورا کرسکتے ہیں اور افریقہ اور ایشیا کو تیسری جنگِ عظیم کا میدان بننے سے روک سکتے ہیں۔ اگر بھارت برطانیہ اور امریکہ کی ملی بھگت سے بحرِ افریشیا کو جنگ کا محاذ بنایا جا سکتا ہے۔ تو افریشیائی برادری تعاون اور تعامل سے اس بحر کی تہ سے امن و انسانیت کے موتی اچھال کر بین الاقوامی سیاست اور تاریخ کی آرائش و تزئین کا خیرہ کن سامان مہیا کرسکتی ہے۔ دیکھئے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا!

پرویز صاحب کا درسِ قرآن

لیہ میں

ہر جمعہ کو نماز جمعہ کے بعد
(ٹھیک تین بجے) نقل ہوٹل
(نزد ریلوے اسٹیشن) میں پرویز
صاحب کا درس قرآن کریم بذریعہ
ٹیپ سنایا جاتا ہے۔
نمائندہ بزم طلوع اسلام
لیہ

لائلپور میں

ہر جمعہ کی شب کو، بعد نماز عشاء، بذریعہ ٹیپ
نمائندہ بزم خان محمد اکرم خان کی قیام گاہ۔
پنجاب ڈیریز۔ (۸۰م۔ اے سیلپر کالونی میں ہوتا ہے۔

لاہور میں

ہر اتوار کو ۲۵ بی گلبرگ
میں ٹھیک ۹ بجے صبح شروع
ہوتا ہے۔
نمائندہ بزم طلوع اسلام
لاہور

نقد و نظر

۱۔ حقیقت المسیح

تصنیف۔ سید عبدالقیوم صاحب قیومی۔ شائع کردہ جماعت مسلمہ منڈی بہاؤالدین۔ ضلع گجرات۔ چھوٹی تقطیع۔ اخباری کاغذ۔ ضخامت ۲۴۰ صفحات۔ قیمت درج نہیں۔ ملنے کا پتہ۔ المکتبۃ القیومیہ۔ سکول محلہ۔ منڈی بہاؤالدین۔

عیسائیت کی بنیاد الوھیت مسیحؑ کے عقیدہ پر ہے۔ اس عقیدہ کے لئے ضروری تھا کہ وہ حضرت مسیحؑ کو عام انسانوں سے بلند الوھیاتی صفات کا حامل قرار دیں۔ چنانچہ اس کے لئے انہوں نے حضرت مسیحؑ کے بن باپ پیدا ہونے اور ان کے زندہ آسمان پر اٹھائے جانے کے عقائد وضع کئے۔ اب اُن کے لئے ان عقائد پر جس قدر بھی زور دیا جائے، قابل فہم ہے، کیونکہ اگر یہ عقائد باقی نہ رہیں تو عیسائیت کی اصل و بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن حیرت ہے ہم مسلمانوں پر کہ ہم مسیحؑ کی الوھیت کا شدت سے انکار کرتے ہیں لیکن حضرت مسیحؑ کے بن باپ پیدا ہونے اور زندہ آسمان پر اٹھائے جانے کے عقائد پر عیسائیوں سے بھی زیادہ شدت سے کاربند ہیں ۔ عیسائیوں سے بھی زیادہ شدت سے اس لئے کہ اب عیسائیوں میں ایسے افراد پیدا ہو رہے ہیں جو ان عقائد کی تردید کرتے ہیں، یا کم از کم ان کی ایسی تاویل کرتے ہیں جس سے یہ مفہوم تشبیہی اور مجازی رہ جاتا ہے۔ حقیقی نہیں رہتا۔ اور اس کے باوجود وہ عیسائیت کے دائرے سے خارج نہیں ہوتے۔ لیکن ہماری ابھی تک یہ کیفیت ہے کہ اگر کوئی شخص ان عقائد کا انکار کرے، یا ان کی ایسی توجیہ بیان کرے جو ہمارے مروجہ موروثی عقائد کے خلاف ہو، اس پر کفر کا فتویٰ لگا کر اسے دائرہ اسلام سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ ہمارے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے اس شدت کا نتیجہ ہے کہ جو لوگ ان عقائد سے اختلاف

رکھتے ہیں انہیں ان کے متعلق بار بار لکھنا پڑتا ہے اور یوں، موافق اور مخالف جماعتوں کی توانائیاں، وقت اور دولت، ایسے مسائل کے حل کرنے میں صرف ہو جاتی ہیں جن کا تعلق زندگی کے عملی مسائل سے کچھ بھی نہیں۔

حضرت مسیح کے بن باپ پیدا ہونے کے عقیدے کی تردید کے لئے، جناب قیومی صاحب نے یہ کتاب شائع کی ہے۔ اس میں قرآن کریم کی متعلقہ آیات سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ حضرت مسیح بن باپ کے پیدا نہیں ہوئے تھے۔ جناب قیومی کی نگاہ قرآن کریم پر بڑی وسیع ہے اور انداز بیان بھی سنجیدہ ہے۔ جو لوگ ان مسائل سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے اس کتاب کا مطالعہ مفید رہے گا۔

ہمیں محترم قیومی صاحب کے تصنیف کردہ چند ایک اور رسائل بھی موصول ہوئے ہیں جن میں مسلمانوں کے کئی ایک اور مروجہ عقائد کی بھی تردید قرآن کریم کی روشنی میں کی گئی ہے۔ ان کا یہ مسلک کہ وہ دین کے معاملہ میں غلط اور صحیح کا معیار قرآن کریم کو قرار دیتے ہیں، درخورِ تحسین ہے۔ لیکن انہی رسائل سے معلوم ہوا کہ وہ بھی اہل قرآن کی طرح تین نمازوں اور دو رکعتوں کی الجھن میں گھرے ہوئے ہیں۔ اے کاش! یہ حضرات اپنی توانائیوں کو امت کے عملی مسائل کے حل کرنے میں صرف کرتے! مسلمانوں کی تباہی نہ تو اس لئے ہوئی ہے کہ انہوں نے تین کی جگہ پانچ نمازیں پڑھنی شروع کر دیں۔ اور نہ ہی ان کی تباہی کا یہ علاج ہے کہ وہ پانچ کی جگہ تین نمازیں پڑھنے لگ جائیں۔

۲۔ کچکول نامہ

قوم کی توانائیاں، وقت اور روپیہ کس قسم کے بے نتیجہ کاموں میں صرف ہو رہا ہے، اس کی ایک اور مثال زیر نظر کتابچہ ہے جو شاہ ولی اللہ اکادمی، حیدرآباد کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ اس اکادمی کا پس منظر یہ ہے کہ سندھ کے کسی مخیر زمیندار (اور ان کی اہلیہ) نے اراضی کا اچھا خاصا رقبہ اس مقصد کے لئے وقف کیا تھا کہ اس کی آمدنی سے شاہ ولی اللہ (علیہ الرحمۃ) کے افکار و نظریات کی اشاعت کی جائے۔ اس مقصد کیلئے یہ اکادمی وجود میں لائی گئی ہے۔ زیر نظر رسالہ مخدوم ابوالحسن واعظی نقشبندی (متوفی سلسلہ ...) کی تصنیف ہے جس میں تصوف کے رموز و اسرار فارسی نظم میں بیان کئے گئے ہیں۔ تصوف کے متعلق اس میں کہا گیا ہے۔

تصوف بے تفقہ زندقہ داں — تفقہ بے تصوف فسق گرداں

تصوف بے تفقہ کیا ہوتا ہے، اس کے متعلق تو ہم کچھ کہہ نہیں سکتے کیونکہ تصوف کی اصطلاح ہی ہمیں خدا اور رسول کے ہاں کہیں نہیں ملتی۔ البتہ دریافت طلب امر یہ ہے کہ "تفقہ بے تصوف" کو جو فسق کہا گیا ہے تو اس کی کیا سند ہے؟ اس لئے کہ کسی عمل کو فسق قرار دینا تو خدا کا حق ہے۔ کیا جس خدا نے تفقہ کا حکم دیا ہے اس نے کہیں ایسا بھی فرمایا ہے کہ تصوف کے بغیر "تفقہ" فسق ہے؟

تصوف کی رو سے تعلیم کس قسم کی ملتی ہے اس کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایئے جس کا تذکرہ رسالہ زیر نظر کے صفحہ ۱۳ کے حاشیہ میں ان الفاظ میں کیا گیا ہے

> اس حکایت کو شیخ عطار نے اپنی تصنیف "تذکرۃ الاولیاء" میں درج کیا ہے کہ حضرت رابعہ بصری نے مکہ مکرمہ جانے کا ارادہ کیا تو انہوں نے راستہ میں دیکھا کہ کعبہ خود ان کے استقبال کے لئے آگیا ہے۔ انہوں نے کعبہ کو دیکھا اور کہا کہ میں رب کعبہ کو چاہتی ہوں۔ تجھے نہیں چاہتی!

معلوم نہیں کہ "رب کعبہ" کو دیکھنے کے لئے کعبہ جانے کی ضرورت کیوں لاحق ہوگئی جب اس نے کہہ دیا ہے کہ میں تمہاری رگ جان سے زیادہ قریب ہوں۔ اور تم جس طرف نگاہ اٹھاؤ مجھے سامنے پاؤ گے۔ بہرحال یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ ہم کہہ یہ رہے تھے کہ یہ ہیں وہ کارہائے نمایاں جن کی سرانجام دہی کے لئے ہمارے اوقاف کی دولت صرف ہو رہی ہے۔ ہم ان حضرات سے اس سے زیادہ کیا عرض کریں کہ مسلمانوں کے سامنے یہ کچھ پیش کرے،

مت رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں انہیں!
پختہ تر کردو مزاج خانقاہی میں انہیں!
تا بساطِ زندگی پر ان کے سب مہرے ہوں مات!

سفر

شعر میں اگر آورد نہ ہو، آمد ہو، تو وہ خود صاحب شعر کا عکاس بن جاتا ہے۔ ہمارے زیر نظر منظوم صحیفہ "سفر" سفر کی روائیداد بیان کرنے والے جسٹس ایس۔ اے۔ رحمان کے قلب و نگاہ کا آئینہ دار اور ان کی افتاد طبیعت اور سیرت کا عکاس ہے۔ پاک اور صاف۔ شفتہ و شگفتہ، نکھری اور اجلی زبان میں، ایک ایسے سفر کی داستان جو جسم آپ میں سے اکثر کو ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ خیز حوادث میں پیش آیا — انتقام جو دشمن کی دنائیت، بیکسوں کی مظلومیت، عفت شعاروں کی بلند حوصلگی، قلب مسلم کی پاکیزگی — ان سب کی نہایت متوازن تصویریں ایک صاف اور شفاف ندی کے لئے رواں دواں سامنے آئیں۔ اور آگے بڑھتی چلی جاتی ہیں جس میں آہنگ کا تنوع، فضائی یکسانیت کو یوں خاموشی سے بدلتا جاتا ہے جس طرح خاموش سینما کے پردے میں کہانی کے پہلو بدلا کرتے تھے۔ یہ تو ہے کتاب کا حسن معنوی۔ اسے مرکزی مجلس ترقی اردو، لاہور نے جس حسین پیکر میں پیش کیا ہے۔ کہ وہ بجائے خویش

ـــ کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست ـــ

کتاب کے گردپوش پر لکھا ہے "قیمت تین روپے"۔ ایسی چیزوں کے لئے "قیمت" کا لفظ تقطیع سے گرا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے کہ ـــ

بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر!

از پرویز

اسلام کیا ہے؟

اس کتاب کا ـــ برسوں سے ـــ انتظار تھا

ہماری یہ دعویٰ ہے (اور مبنی برایمان دعویٰ) کہ اسلام نوعِ انسان کی تمام مشکلات کا حل پیش کرتا ہے لیکن جب پوچھا جاتا ہے کہ اسلام ہے کیا؟ تو مختلف گوشوں سے مختلف آوازیں اٹھتی ہیں جن کا ماحصل نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے مسائل سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ ظاہر ہے کہ اگر اسلام صرف یہی ہے تو اس سے زندگی کے مسائل کا حل نہیں مل سکتا۔

اسلام ایک نظامِ حیات ہے جس کی بنیادیں چند غیر متبدل تصورات پر قائم ہیں۔ جب تک یہ تصورات واضح طور پر سامنے نہ آئیں اسلام بحیثیت ایک نظامِ حیات کے سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ضرورت تھی کہ ان تصورات کو واضح اور دلکش انداز میں یکجا پیش کیا جائے ـــ یہ کتاب اس ضرورت کو پورا کر دیتی ہے۔

کتاب سولہ ابواب پر مشتمل ہے جن میں سے ہر باب، مصنف کے مدت العمر کے مطالعہ اور تدبر فی القرآن کا ماحصل پیش کرتا ہے ـــ یہ کتاب ہے (۱) ہمارے مذہب گزیدہ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ میں آجائے۔ تو انہیں علی وجہ البصیرت اسلام کا گرویدہ بنادے اور (۲) غیر مسلموں کے ہاتھ میں دیجئے تو اسلام کے متعلق ان کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں۔

کتاب قریب پونے چار سو صفحات پر مشتمل ہے اور دو اقسام میں شائع کی گئی ہے۔

قسم اول:۔ اعلیٰ سفید کاغذ۔ مضبوط جلد حسین گردپوش۔ قیمت فی جلد ـــ آٹھ روپے

قسم دوم:۔ کیمیکل پیپر۔ پکس بورڈ کور۔ قیمت فی جلد ـــ چار روپے

فرمائش کیساتھ اس کی تصریح کر دی جائے۔ کہ کون سی جلد مطلوب ہے۔

ملنے کا پتہ ہے:۔ ادارہ طلوعِ اسلام ۔ ۲۵/بی گلبرگ لاہور

بچوں کا صفحہ

دُوسروں کے لئے جیو

"کتا کتے کا ویری ہوتا ہے"

یہ ایک پرانا محاورہ ہے جو آج بھی اتنا ہی صحیح ہے جتنا اس وقت جب یہ محاورہ بنا تھا۔ کتے میں بڑے وصف ہوتے ہیں۔ سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ مالک کا وفادار ہے۔ جس کا کھاتا ہے اسی کا ہو رہتا ہے۔ مالک کی چوکیداری پوری مستعدی سے کرتا ہے۔ بلّی کو تم گھر میں رکھ کر پالتے ہو۔ مگر وہ تمہاری بلّی تم ہی سے میاؤں کرے گی۔ تم اُسے کسی بات سے روکو، تو تمہارا سارا احسان بھول کر تمہیں گھُرکے گی دودھ کے برتن کو ہزار چھپا کر رکھو وہ اسے چھیڑنے کی ضرور کوشش کرے گی کبھی کبھی بلّی کے بھاگوں چھینکا لوٹ بھی جائے گا۔ بلّی کے برعکس کتا بھوکا مر جائے گا مگر مالک کی اجازت کے بغیر کھانے پینے کی چیز کو نہیں چھیڑے گا۔ ایسے بھی واقعات ہوئے ہیں۔ کہ کتا اپنے مالک کے ساتھ کسی ویرانے میں گیا۔ وہاں مالک کو کسی دشمن نے مار ڈالا۔ کتا بھوکا پیاسا اپنے مالک کی لاش اور اس کے بعد اس کی قبر کے پاس بیٹھا رہا۔ گویا کتا اپنے مالک کا وفادار اس کی زندگی میں بھی ہوتا ہے اور اس کے مرنے کے بعد بھی۔

اتنے بڑے وصف کے ہوتے ہوئے بھی کتا بدنام ہے۔ تم کسی بُرے آدمی کو مہذب گالی دینا چاہتے ہو تو اسے کتا کہہ دیتے ہو۔ کوئی شخص فضول اور بیکار باتیں کرنے لگے تو تم کہتے ہو: کتا

بھونک رہا ہے" آخر وہ کون سی بُری بات ہے۔ جس سے کتے کی ساری خوبیاں ضائع ہوگئیں؟ یہ بُری بات صرف یہ ہے کہ کتا کتے کا ویری ہوتا ہے۔ وہ اپنے ہم جنس کو دیکھ کر غصے سے بھر جاتا ہے۔ اُسے دیکھتے ہی غرّانے لگتا ہے بھونکتا ہے۔ اس کو بھگانے کی کوشش کرتا ہے۔ خود ہڈی لیکر بیٹھا ہو تو ہر راہ جاتے کتے پر بوں قہر بھری نظریں ڈالتا ہے گویا وہ اسکی ہڈی چھیننے آیا ہے۔ اُسے اپنے ہم جنس کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔ محض یہی نہیں کہ ہمدردی نہیں ہوتی بلکہ اس سے نفرت ہوتی ہے مالک کا وفادار اور جانثار کتا اپنے بھائی کی جان کا دشمن ہوتا ہے۔ کتے کے متعلق مشہور ہے۔ کہ وہ اپنی گلی میں شیر ہوتا ہے۔ کوئی اجنبی کتا بھولے بھٹکے اس کی گلی میں آ جائے۔ تو وہ اس کے سر ہو جاتا ہے۔ خود بھونکتا ہے۔ بھونک بھونک کر گلی کے تمام دوسرے کتوں کو بلاتا ہے اور سب کتے مل کر اس مسافر کتے کو دور بھگا کے دم لیتے ہیں۔

اب تک بات کتے کی ہو رہی تھی تم یقیناً سوچ رہے ہوگے کہ کتے کی یہ عادت بہت بُری ہے کہ وہ اپنے بھائی کو دیکھ کر نفرت اور غصے سے بھر جاتا ہے۔ دوسرے کتے کو تکلیف پہنچا کر اسے راحت ملتی ہے۔ وہ خود حرص اور لالچ سے کھا پی لیتا ہے مگر دوسرے بھوکے کتے کو حصہ نہیں دیتا۔ اپنوں کے ساتھ اسے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی۔

اب تم تھوڑی دیر کے لئے کتے کو الگ کر دو۔ اور یہ سوچو کہ تم سے کوئی یہ کہے۔" فلاں شخص اپنے بھائی کو دیکھ کر نفرت اور غصے سے بھر جاتا ہے۔ دوسرے آدمی کو تکلیف پہنچا کر اُسے راحت ملتی ہے۔ وہ خود حرص اور لالچ سے کھا پی لیتا ہے۔ مگر دوسرے بھوکے آدمی کو حصہ نہیں دیتا۔ اپنوں کے ساتھ اسے کوئی ہمدردی نہیں ہوتی"۔۔۔ تو اس شخص کیمتعلق تمہاری کیا رائے ہوگی تم یقیناً کہوگے کہ یہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ یہ خود غرض آدمی ہے۔ وہ صرف اپنی ذات کا بھلا چاہتا ہے۔ دوسرے کی تکلیف سے اُسے تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔ بلکہ بعض اوقات تو دوسروں کی تکلیف سے اُسے لذت محسوس ہوتی ہے۔

یہ انسان، انسان ہونے کے باوجود انسانیت سے عاری ہوتا ہے۔ حیوان، اور انسان میں فرق یہی ہے۔ کہ حیوان

اپنی ذات کے لئے جیتا ہے۔ وہ اپنے فائدے کا خیال رکھتا ہے اور بس دوسرے کے فائدے سے اُسے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ مگر انسان صرف اپنے لئے نہیں بلکہ اس کے ساتھ دوسروں کے لئے بھی جیتا ہے۔ یہ جو تم نے پچھلے دنوں بھارت کے ساتھ جنگ کے دوران یہ دیکھا، سنا اور پڑھا ہے۔ کہ ہمارے لوگوں نے "قربانی" دی تو اس کا مطلب یہی ہے کہ ان لوگوں نے اپنی ذات کے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے، ملک کے لئے، اور قوم کے لئے اپنا آرام، اپنا مال متاع بلکہ اپنی جانیں تک قربان کر دیں — دنیا میں لوگوں نے دولت کے ڈھیر اکٹھے کئے۔ حکومت کا دبدبہ پیدا کیا۔ مگر دنیا نے یاد ان کو رکھا جن کے پاس یہ جذبہ تھا۔ کہ وہ دوسروں کی خاطر زندہ رہیں گے اور دوسروں کی خاطر مریں گے۔ خالد بن ولیدؓ، محمد بن قاسمؒ، طارق بن زیادؒ، کے نام صدیوں سے عقیدت اور محبت سے لئے جاتے ہیں۔ اور انہیں ہمیشہ اسی عزت اور پیار سے یاد کیا جائیگا۔ ابھی کل تک کسی نے عزیز بھٹی خادم حسین، شفقت بلوچ، عالم، ظفر مسعود کا نام تک نہ سنا تھا۔ مگر آج تم میں سے کون ایسا ہے جو ان کی تصویریں گھر میں رکھنا نہیں چاہتا۔ اُن کا ذکر کسی محفل میں چلتا ہے۔ تو سنانے والے سنا سنا کے نہیں تھکتے۔ اور سننے والے سنتے سنتے، اکتاہٹ محسوس نہیں کرتے۔

ان شہیدوں اور غازیوں کا کمال کیا ہے؟ یہی نا کہ انہوں نے اپنے فائدے کی، اپنے آرام کی پروا نہ کی بلکہ تن، من دھن سب کچھ نچھاور کر دیا —— محض اس خیال سے کہ قوم سربلند ہو۔ وطن محفوظ رہے تاکہ اس میں اسلام کا بول بالا ہو سکے۔

آج جب تم عزیز بھٹی کی تصویر والا کیلنڈر گھر میں لٹکاتے ہو یا یونس حسن کی تصویر کاٹ کر اپنے البم میں سجانے ہو تو سوچو کہ کیا تم نے اپنے آپ کو ان بہادروں کے نقش قدم پر چلنے کے لئے تیار کر لیا ہے۔ کل یہ کام تمہیں کرنے ہوں گے۔ جن کی وجہ سے ان بہادروں کے نام آج تم فخر سے لیتے ہو۔ ان شیر دل مجاہدوں نے اپنے خون سے جو شمع روشن کی ہے اسے لے کر تمہیں آگے بڑھنا ہے۔ انہوں نے جو کام ادھورا چھوڑا ہے۔ اسے تمہیں پورا کرنا ہے۔ انہوں نے جو راہیں بنائیں ہیں ان پر چل کر تمہیں اسلام کا جھنڈا اونچا رکھنا ہے۔

تم پر جو ذمہ داریاں آگے چل کر آنے والی ہیں۔ ان کے لئے تم کس حد تک تیاری کر رہے ہو؟ —— اس کو تم ایک پیمانہ سے ناپ سکتے ہو۔ آج تمہیں ایک آئینہ دیا جاتا ہے۔ اسے سامنے رکھ کر تم اس میں سے اپنے آپ کو بخوبی دیکھ سکو گے۔

دیکھنا یہ ہے کہ سکول میں اپنی جماعت کے کمرہ میں بنچ یا ڈیسک پر بیٹھتے ہوئے تم کسی ساتھی یا ہم جماعت کو دیکھ کر اور پھیل جاتے ہو۔ کہ وہ تمہارے ساتھ نہ بیٹھ سکے یا تم سکڑ کر اُسے خود پاس بیٹھنے کی دعوت دیتے ہو؟

بس میں سوار ہوتے وقت، ہلڑ بازی کرتے ہوئے، قطار توڑتے ہوئے، اندر داخل ہوتے ہو یا شرافت سے ان لوگوں کو پہلے چڑھنے کا موقع دیتے ہو جو قطار میں تم سے آگے کھڑے ہوتے ہیں؟ اور پھر بس میں پہنچکر تم جلدی جلدی سیٹ پر بیٹھ جانے کی کوشش کرتے ہو، یا کسی بوڑھے، معذور یا اپنے سے کسی چھوٹے کو سیٹ پر بٹھا کر خود کھڑے رہتے ہو؟

دوستوں اور ہم جولیوں میں تم اپنی ہی باتیں کہے چلے جاتے ہو یا اپنی کہہ کر دوسروں کو بھی کہنے کا موقع دیتے ہو؟

گھر میں کبھی کوئی مٹھائی وغیرہ آتی ہے۔ تو تم ضد اور لالچ کرکے اپنے حصے سے زیادہ کھا لینے کی کوشش کرتے ہو یا اپنے بہن بھائیوں میں بیٹھ کر محض اپنے حصے کی چیز کھا کر مطمئن ہو جاتے ہو؟

ایسا تو نہیں کہ گھر میں جو کچھ پکتا ہے وہ عام طور پر تمہیں پسند نہیں ہوتا اور ہر روز تم نئی چیز کی فرمائش کر دیتے ہو؟

ابا اور امی کو تم بے جا ضد اور شور و غوغا سے پریشان رکھتے ہو یا ان کے کام میں ہاتھ بٹا کر یا اچھی اچھی باتیں کر کے ہی ان کا دل خوش کرنے کی کوشش کرتے ہو؟

تم ایسا تو نہیں کرتے کہ جس امتحان میں فیل ہو جاتے ہو اس کی رپورٹ تم گھر لاتے ہی نہیں۔ اور جھوٹ بول دیتے ہو کہ رپورٹ ملی ہی نہیں؟

روتی ہوئی چھوٹی بہن یا روتے ہوئے چھوٹے بھائی کو روتا دیکھ کر تم اس کا منہ چڑاتے ہو تاکہ وہ اور روئے یا اسے اٹھا کر اس کا جی بہلاتے ہو؟

اپنے کسی دوست، ہم جماعت یا ساتھی کو اداس دیکھ کر تم اس سے کنی کترانے کی کوشش کرتے ہو یا اس سے اس کی اداسی کی وجہ پوچھتے ہو؟ اور اس کے ساتھ مذاق کرنے کی بجائے اس کا بوجھ ہلکا

کرنے کی کوشش کرتے ہو؟
تم کتنی بار ضرورت کے بغیر نئی کاپی ، ..... نیا قلم ، نیا پنسل تراش (شارپنر) یا نئی پنسل خرید لیتے ہو؟ اور آئندہ تم نے بلا ضرورت پیسے خرچ کرنے سے بچنے کے لئے پکا ارادہ کر لیا ہے یا نہیں؟
پچھلی مرتبہ تمہیں ضابطے اور قاعدے کی پابندی کرنے کا جو طریقہ بتایا گیا تھا۔ اس پر تم نے کس حد تک عمل کیا ہے؟
یہ اور اس طرح کی بیشمار چھوٹی چھوٹی باتوں سے تم اپنی جانچ پڑتال کر سکتے ہو۔ اسطرح کی جانچ پڑتال کرکے تم جہاں کہیں خرابی دیکھو اسے خود ہی ٹھیک کرنیکی کوشش کرو۔ آج کے غازیوں کے گن گانیوالی قوم کل تمہارا نام لے لیکر فخر کرے گی۔

(یونس بھائیجان)

انسانی مسائل کے حل کرنے میں

عقل انسانی آجتک کن ارتقائی مراحل سے گزری اور اس نے کہاں کہاں اور کیا کیا ٹھوکریں کھائیں تاریخ انسانی کی یہ عبرت آموز تفصیل آپ کو مرزا پرویز صاحب کی مشہور کتاب

انسان نے کیا سوچا؟

میں ملے گی۔ ہزاروں کتابوں کا نچوڑ۔ افلاطون اعظم سے لیکر آجتک گذشتہ ساڑھے تین ہزار برسوں میں دنیا کے چوٹی کے مفکرین، مورخین، اور علمائے اخلاقیات و عمرانیات اور ماہرین معاشیات و سیاسیات نے کیا کچھ سوچا۔
اسے پڑھیئے اور سوچیئے۔ کہ وحی کی روشنی سے روگرداں اور محروم ہوکر نوع انسانی نے اپنے لئے کیا جہنم خرید لیا۔

قیمت مجلد ـــــ بارہ روپے

ملنے کا پتہ:۔ ادارہ طلوع اسلام۔ ۲۵/بی گلبرگ لاہور

ایڈیٹر۔ صفدر سلیمی۔ ناشر سراج الحق۔ مقام اشاعت ۲۵/بی گلبرگ۔ لاہور۔ پرنٹر شیخ محمد اشرف۔ مطبوعہ اشرف پریس ایبک روڈ۔ لاہور

وہ کتابیں جن سے اسلام کا صحیح تصور سامنے آجاتا ہے

لغات القرآن — قرآن کریم کے تمام الفاظ کا مستند، واضح اور حقیقی مفہوم جس سے قرآنی تعلیم نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ یہ قرآن کی ڈکشنری نہیں نئے انداز میں اس کی تفسیر ہے۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت۔ پندرہ روپے فی جلد۔ چوتھی جلد کی قیمت۔ بارہ روپے مکمل سیٹ کی رعایتی قیمت پچاس روپے۔

اسلام کیا ہے؟ — دین کے بنیادی تصورات کا نہایت حسین اور دلکش مرقع۔ قسم اعلیٰ (آٹھ روپے) جیب ایڈیشن (چار روپے)۔

قرآنی فیصلے — زندگی کے مختلف مسائل اور معاشرہ کے معاملات کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے۔ بڑی معلومات افزا کتاب ہے۔ جلد اوّل (تین روپے پچیس پیسے)، جلد دوم (تین روپے پچیس پیسے) جلد سوم (تین روپے)۔

سلیم کے نام خطوط — ہمارے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے دل میں اسلام کے متعلق طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ ان سوالات کا نہایت سادہ اور دلکش خطوط کے انداز میں جواب۔ مذہب گزیدہ نوجوانوں کو اسلام کی طرف لانے کے لئے بڑی کامیاب کوشش ہے۔

جلد اوّل (آٹھ روپے) جلد دوم (چھ روپے) جلد سوم (چھ روپے)۔

انسان نے کیا سوچا؟ — افلاطون سے لیکر اس وقت تک کے مختلف مفکرین، مورخین اور سائنسدانوں نے زندگی کے مسائل کے متعلق کیا کہا ہے۔ کیا وہ انسانی دنیا کی گتھیاں سلجھا سکے ہیں؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے بے نیاز کر دے گی۔ قیمت، بارہ روپے

نظام ربوبیت — انسانی زندگی کا پہلا مسئلہ روٹی کپڑے کا ہے۔ کیا یورپ یا روس کا نظام اس مسئلہ کا اطمینان بخش حل پیش کر سکا ہے؟ قرآن اس کا کیا حل پیش کرتا ہے۔ معاشی دنیا کی انقلاب آفریں کتاب ہے۔ (چار روپے)

ابلیس و آدم — آدم۔ ملائکہ۔ ابلیس۔ شیطان۔ جنات۔ وحی۔ نبوت کے متعلق قرآنی تصورات۔ (آٹھ روپے)

من و یزداں — خدا کیا ہے۔ انسان کیا ہے۔ ان دونوں کا تعلق کیا ہے۔ تقدیر کسے کہتے ہیں۔ دعا کا مفہوم کیا ہے۔ (دس روپے)

برق طور — صاحب ضرب کلیمؑ اور فرعون کی آویزش۔ بنی اسرائیل کے عروج و زوال کی داستان، جو یوں کہئے کہ خود ہماری داستان ہے۔ (چھ روپے)

شعلۂ مستور — حضرت عیسیٰؑ کی بصیرت افروز داستان حیات۔ کیا آپ بن باپ کے پیدا ہوئے تھے؟ کیا آپ ابھی تک زندہ ہیں؟ کیا آپ دوبارہ تشریف لائیں گے؟ (چھ روپے)۔

سلسبیل — پرویز صاحب کے خطابات اور مقالات کا فکر انگیز مجموعہ۔ (آٹھ روپے)

فجر الاسلام، ضحی الاسلام — مصر کے نامور مورخ علامہ احمد امین (مرحوم) کی معرکۃ الآراء تصانیف کا اردو ترجمہ۔ زمانہ قبل از اسلام لیکر شباب اسلام تک کی تحقیقاتی داستان۔ ان کتابوں نے عالم اسلام میں بڑی شہرت حاصل کی ہے۔ (فجر الاسلام (آٹھ روپے) ضحی الاسلام (پانچ روپے)

الفتنۃ الکبریٰ — مصر کے شہرہ آفاق (نابینا) مورخ ڈاکٹر طہٰ حسین کی شہرہ آفاق کتاب کا اردو ترجمہ۔ عہد حضرت عثمانؓ کے خونچکاں واقع کا پس منظر اور اس کے اسباب۔ ان واقعات کا ذمہ دار کون تھا؟ (چھ روپے)۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۔ ۲۵/بی ۔ گلبرگ ۔ لاہور

پرویز صاحب کی عمر بھر کی قرآنی فکر کا ماحصل

انقلاب انگیز کتابیں

سلیم کے نام خطوط

ہمارا تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ ایک عجیب کشمکش میں گرفتار ہے۔ اسلام کے متعلق اسکے دل میں سینکڑوں شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں لیکن اسے ان کا کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ جب وہ اس طرح مذہب سے متنفر ہو جاتا ہے تو ہم اسے کوسنے لگ جاتے ہیں۔ اسے کوسنے نہیں۔ یہ کتاب دیجئے اور پھر دیکھئے کہ وہ کس طرح صحیح اسلام کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ خطوط کا انداز دلکش اور ہلکا پھلکا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ کاغذ۔ مجلد۔ پہلی جلد آٹھ روپے۔ دوسری و تیسری جلد ۔۔ روپے فی جلد

انسان نے کیا سوچا؟

کیا تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت کر سکتی ہے؟ اس اہم اور پیچیدہ سوال کا جواب یونان کے فلاسفروں سے لے کر ہمارے زمانے کے مفکرین اور سائنسدانوں نے کیا دیا ہے؟ یہ کتاب آپ کو سینکڑوں کتابوں سے مستغنی کر دے گی۔ بڑی تقطیع خوبصورت ٹائپ عمدہ سفید کاغذ مجلد (بارہ روپے)

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں بلکہ مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے۔ اس کی تعلیم کیا ہے۔ اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا مقام کیا متعین کرتا ہے۔ چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ۔ عمدہ سفید کاغذ۔ خوبصورت جلد۔ پہلی تین جلدوں کی قیمت ۔۔ روپے فی جلد چوتھی جلد بارہ روپے (جلدیں) ۔۔ چکی ہیں۔

عہد آفریں کتابیں

بصیرت افروز کتابیں

سلسبیل

پرویز صاحب کے خطبات اور مقالات نے ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے دل و دماغ میں عجیب خوشگوار انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ سلسبیل انہی خطبات و مقالات کا دلکش مجموعہ ہے جس میں زندگی کے مختلف گوشے ابھر کر سامنے آ گئے ہیں۔ ایسی کتابیں عہد آفریں ہوتی ہیں۔ کتابت دلکش کاغذ عمدہ قیمت مجلد آٹھ روپے

اسلام کیا ہے

یہ مسائل کی کتاب نہیں۔ یہ آپ کو بتائے گی کہ اسلام کے بنیادی تصورات کیا ہیں۔ وہ کس قسم کا معاشرتی۔ معاشی اور سیاسی نظام قائم کرنا چاہتا ہے۔ اس کی رو سے انسانی پیدائش کا مقصد کیا ہے اور اس کی غرض و غایت کیا۔ اور معاشرہ میں عورت کا مقام کیا ہے۔ (قسم اول - آٹھ روپے) پیپر ایڈیشن - چار روپے

معلومات افزا کتابیں

ناظم ادارہ طلوع اسلام — ۲۵ بی۔ گلبرگ۔ لاہور